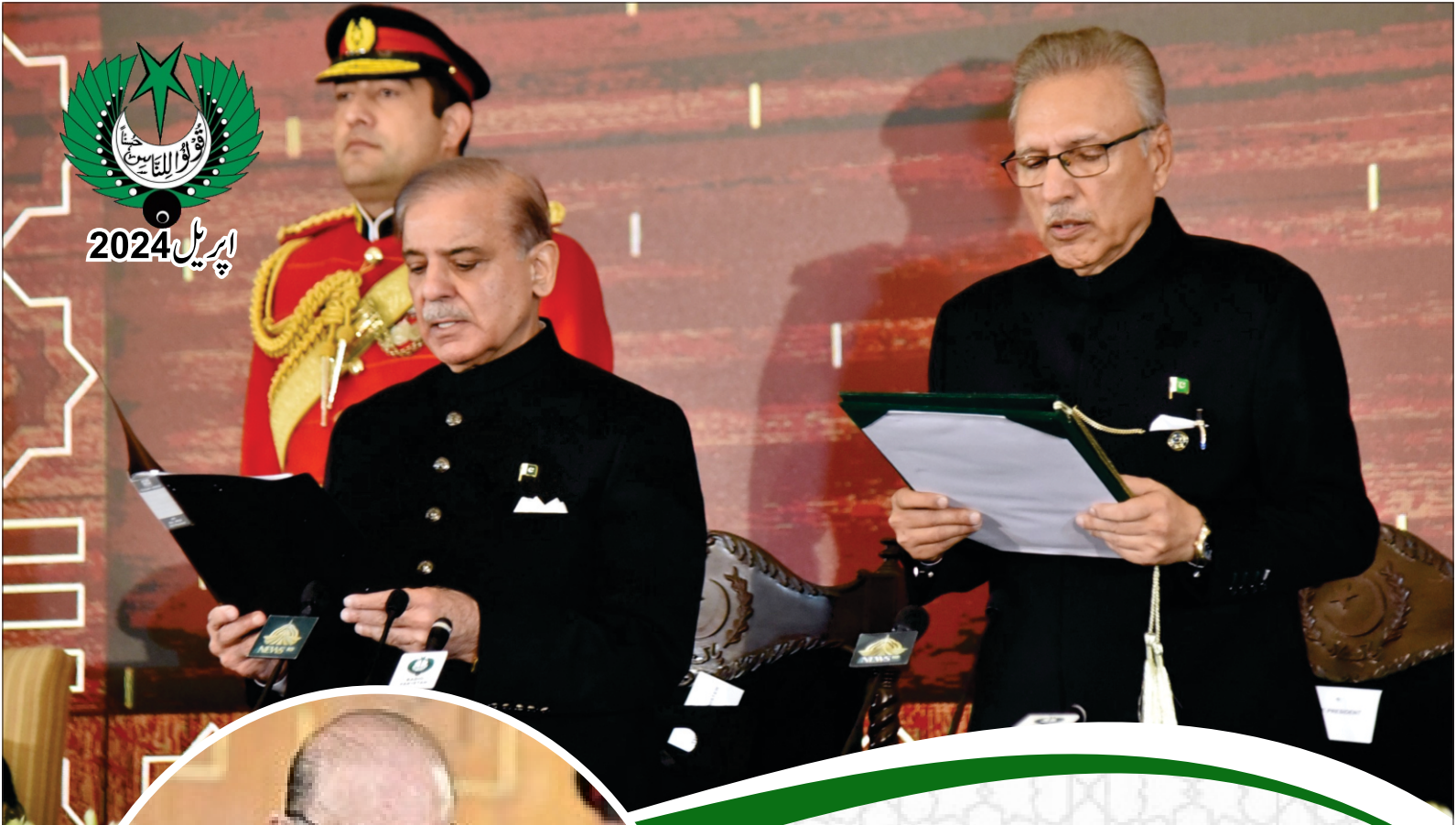

اپریل 2024





ماہنامہ

# آہنگ

۱۹۴۸ء سے مسلسل اشاعت

# عیدالفطر مُبارک

# اداریہ

رمضان المبارک کا ماہِ مبارک اپنی رحمت اور برکتوں کے ساتھ گزر رہا ہے۔ یقیناً اس بابرکت مہینے میں ہر مسلمان نے اپنی حیثیت اور توفیق کے مطابق بارگاہِ الٰہی میں اپنی کوتاہیوں، خطاؤں کی بخشش کی دعائیں ضرور کی ہوں گی۔ اللہ رب العزت غفور الرحیم ہے، وہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم نیک نیتی سے اپنے گناہوں کی معافی کے خواستگار ہوں اور وہ ہمیں معاف نہ کرے۔ اس ماہِ مبارک کی عبادات کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی ایسے بسر کریں جیسا کہ ہم اس ماہِ مبارک میں گزارتے ہیں۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہمیں احسن عمل کرنے والا مسلمان بنائے اور عید کی خوشیوں میں تمام ضرورت مندوں کو شریک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حکومت کی تبدیلی کا جمہوری عمل اپریل کے آغاز میں مکمل ہوا اور میاں شہباز شریف پاکستان کے 24ویں وزیراعظم منتخب ہوئے۔ اس کے بعد کابینہ کی تشکیل مکمل ہوئی اور تمام وزراء کو محکمے تفویض کر دیئے گئے۔ اسی طرح چاروں صوبائی حکومتوں نے بھی حلف برداری کے بعد اپنی اپنی کابینہ تشکیل دے دی ہے اور ملک میں نئی قومی اور صوبائی جمہوری حکومتیں ملک کے استحکام میں معاشی ترقی اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہیں۔ امید ہے کہ وطنِ عزیز اس جمہوری عمل کے تکمیل کے بعد سیاسی اور معاشی استحکام کی جانب بڑھے گا۔ انشاءاللہ۔

اپریل کا مہینہ حکیم الامت، شاعرِ مشرق اور عظیم مفکر کی یاد دلاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے اشعار کے ذریعے مردہ قوم کو ایک نئی زندگی سے فیض یاب کر دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی فلسفیانہ شاعری سے مسلمانانِ برصغیر کی سیاسی طور پر ذہنی آبیاری کی۔ آپ نے بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کو اپنی شاعری کا نہ صرف موضوع بنایا بلکہ مسلمانوں کو درپیش مسائل سے نکالنے کے لیے بھی ہمہ وقت مصروفِ عمل رہے۔ اُن کی پوری شاعری میں اپنی قوم کا درد آنسو بن کر جھلکتا نظر آتا ہے۔ علامہ اقبالؒ مرتے دم تک برصغیر کے مسلمانوں کے لیے مسلسل جدوجہد میں مصروف ہے۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

بالکل اِسی شعر کے مصداق جمہوری افق پہ طلوع ہونے والے قائدِ عوام مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کو متفقہ آئین دینے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں جمہوری شعور کی بھی آبیاری کی اور جمہوریت کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر کو وہ زندہ حقیقت عطا کی جس کی بازگشت آج بھی جمہوری روایات کی پاسداری کی علامت کے طور پر یاد رکھی جاتی ہے۔


سرپرستِ اعلیٰ
شاہیرہ شاہد

نگرانِ اعلیٰ
سعید احمد شیخ

نگران
افشاں نگار

معاونت
امان اللہ سپرا
انعام الحق
شاہد امین
عاقل خان

گرافک ڈیزائننگ
محمد شفیع

کمپوزنگ
بلال احمد بٹ


# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| نومنتخب وزیراعظم شہباز شریف کی تقریب حلف برداری | | 01 |
| نومنتخب صدر جناب آصف علی زرداری کی تقریب حلف برداری | | 02 |
| قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو سابق وزیراعظم | | 03 |
| عالمی سروس کا افتتاح | | 04 |
| سیکرٹری اطلاعات ونشریات محترمہ شاہیرہ شاہد کا دورہ ریڈیو پاکستان کراچی | | 06 |
| قابلِ تقلید---------- | | |
| حضرت سچل سرمست | | 07 |
| رحمٰن بابا ایک صوفی شاعر | ادارہ | 10 |
| علامہ اقبالؒ کی زندگی اور نئی نسل | ڈاکٹر جاوید منزل | 11 |
| علامہ اقبالؒ ایک عظیم شاعر | افشاں نگار | 13 |
| طلوعِ سحر (افسانہ) | سعد انور | 15 |
| علم ودانش---------- | | |
| آغا حشر کاشمیری | سبین حیات | 18 |
| اندھیری رات کی بارش | اے حمید | 20 |
| کمرہ نمبر 5 ڈرامہ | سید امتیاز علی تاج | 22 |
| اندازِ بخن---------- | | |
| باکمال رمز آشنا عہد ساز شاعر عزیز حامد مدنی | اقتباس ڈاکٹر ابنِ حسن بدایونی | 29 |
| عرش صدیقی | ادارہ | 31 |
| مضامین---------- | | |
| یکم اپریل ایک تاریخ ساز دن | الطاف احمد خان | 32 |
| عالمی یومِ کتاب وحقوقِ اشاعت | ادارہ | 34 |
| مچھروں کا خاتمہ، تحفظ کی ضمانت | عمران منور | 36 |
| بیساکھی میلا | علی ناصر خان | 38 |
| طنز ومزاح---------- | | |
| پھول | احمد ندیم قاسمی | 39 |
| لائبریری سے چرائی گئی کتاب | (انشائیہ) انور سدید | 40 |
| آپ اور ہم (خاکہ) | ممتاز مفتی | 41 |
| کمر کا درد | حکیم محمد سعید | 44 |
| PBA میں جامع ٹریننگ پروگرام کے انعقاد کی افتتاحی تقریب | | 45 |
| اسٹوڈیو ریڈیو پاکستان حیدرآباد | | 47 |
| خواتین کا عالمی دن | | 49 |
| انٹرویو | کامران طارق | 51 |
| استاد بڑے غلام علی خان | | 53 |
| استاد نتھو خان | | 54 |
| اقبال بانو | | 55 |
| ملی نغمہ | فاروق ملانہ سیال | 56 |
| احمد رشدی | | 57 |
| بچوں کا ادب | | 59 |

# پاکستان کے نومنتخب وزیراعظم جناب میاں محمد شہباز شریف کی حلف برداری کی تقریب

رپورٹ: افشاں نگار

پاکستان کے نومنتخب وزیراعظم جناب میاں محمد شہباز شریف نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے 24ویں وزیراعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا۔حلف برداری کی یہ پُر وقار تقریب ایوان صدر میں منعقد کی گئی۔صدر مملکت جناب عارف علوی نے نومنتخب وزیراعظم جناب میاں محمد شہباز شریف سے دوسری بار حلف لیا۔وزیراعظم جناب میاں محمد شہباز شریف نے صدرِ مملکت جناب عارف علوی کے کہے گئے الفاظ دہرائے اور مملکت کے لیے بلاعناد وتفریق کام کرنے کا عزم کیا۔حلف اٹھانے کے بعد جناب صدر عارف علوی نے نومنتخب وزیراعظم جناب میاں محمد شہباز شریف کو مبارکباد پیش کی۔

اس تقریب میں پاکستان آرمی چیف آف جنرل سٹاف عاصم منیر اور چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی ساحر شمشاد مرزا اور دیگر سروسز چیف بھی شریک تھے۔اس کے علاوہ سابق صدر آصف زرداری مسلم لیگ ن کے قائد نواز شریف، چیئرمین پیپلز پارٹی بلاول بھٹو زرداری، نگران وزیراعظم انوار الحق کاکڑ، چیئرمین سینٹ صادق سنجرانی، اسپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق، وزیراعلی پنجاب مریم نواز، وزیراعلی سندھ مراد علی شاہ اور وزیرِ اعلی بلوچستان سرفراز بگٹی بھی تقریب میں شریک تھے جبکہ مختلف ممالک کے سفیر بھی تقریبِ حلف برداری میں موجود تھے۔

حلف برداری کے بعد وزیراعظم ہاؤس میں وزیراعظم جناب میاں محمد شہباز شریف کے اعزاز میں گارڈ آف آنر کی تقریب ہوئی۔ جہاں مسلح افواج کے چاق و چوبند دستے نے وزیراعظم جناب میاں محمد شہباز شریف کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔بعدازاں وزیراعظم جناب شہباز شریف سے وزیراعظم آفس کے عملے کا تعارف کرایا گیا اس دوران وزیراعظم نے عملے سے مصافحہ کیا۔

# نومنتخب صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری کی تقریب حلف برداری

رپورٹ عمران علی منور

جناب آصف علی زرداری نے دوسری بار پاکستان کے 14ویں صدر مملکت کے عہدے کا حلف اٹھالیا۔ چیف جسٹس پاکستان، جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے اُن سے حلف لیا۔تقریب حلف برداری میں آرمی چیف جنرل سید عاصم منیر، ن لیگ کے قائد نواز شریف، وزیراعظم جناب میاں شہباز شریف اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول بھٹو بھی شریک تھے۔

حلف برداری کی یہ پُر وقار تقریب اتوار کی سہ پہر ایوان صدر میں منعقد ہوئی۔اس تقریب میں وزیراعظم جناب شہباز شریف سبکدوش ہونے والے ڈاکٹر عارف علوی، سابق نگران وزیراعظم انوار الحق کاکڑ، گورنر پنجاب بلیغ الرحمٰن، گورنر خیبر پختونخواہ حاجی غلام محمد، گورنر سندھ کامران تیسوری، وزیراعلیٰ سندھ مراد علی شاہ، وزیراعلیٰ بلوچستان سرفراز احمد بگٹی، چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی جنرل ساحر شمشاد، آرمی چیف سید عاصم منیر، پاک بحریہ کے سربراہ ایڈمرل نوید اشرف، پاکستان فضائیہ کے سربراہ ایر چیف مارشل ظہیر احمد بابر سدھو، نومنتخب اراکین قومی اسمبلی اور غیر ملکی سفارتکاروں نے شرکت کی۔اس موقع پر پاکستان مسلم لیگ (ن) کے قائد نواز شریف، سینئر اسحاق ڈار سیکرٹری قومی اسمبلی، سردار ریاض صادق، پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول بھٹو اور آمنہ بھٹو، فریال تالپور، سابق سپیکر راجہ پرویز اشرف، یوسف رضا گیلانی سپیکر پنجاب اسمبلی ملک احمد خان، شرجیل میمن ملک عامر فدا پراچہ، نواب جمال خان ریسانی سمیت دیگر قیادت موجود تھی۔

تقریب میں شریک پیپلز پارٹی کے مہمانوں اور ارکان پارلیمنٹ نے جوش وخروش سے اپنی پارٹی کی نمائندگی۔اس تقریب میں بلاول بھٹو اور آمنہ بھٹو کے ساتھ بختاور بھٹو بھی اپنے چھوٹے بچوں کے ہمراہ موجود تھیں۔حقیقتاً صدرِ پاکستان جناب آصف علی زرداری دوسری بار صدر منتخب ہونے والے پہلے سویلین ہیں جو اس مقابلے میں کسی سے ہارے نہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے کہ ریڈیو پاکستان نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کے پاس خاصی بڑی تعداد میں ٹرانسمیٹر زاور سٹوڈیوز ہیں اور ایسا عملہ ہے جو عوام کی تربیت اور ان کی تفریح تباہ کا سامان بہم پہنچانے، حکومت کی پالیسیوں کی وضاحت کرنے اور خیر سگالی کو فروغ دینے کے لیے محنت طلب کام میں دن رات مصروف ہے۔ یہ امر بھی حوصلہ افزا ہے کہ ریڈیو پاکستان نے نئے اسٹیشن کھولنے اور نئے ٹرانسمیٹر نصب کرنے کی غرض سے ایک ہنگامی اور ہمہ گیر پروگرام کا آغاز کیا ہے تاکہ پاکستان کے ہر ایک علاقے میں میڈیم ویو پر آواز صاف سنائی دے اور بیرونی سامعین تک آواز صاف پہنچ جائے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت آپ کی ترقیاتی تجاویز پر مستعدی سے غور وخوض کرے گی اور ہر ممکن امداد پہنچائے گی۔

حکومت اس بات سے واقف ہے کہ ریڈیو پاکستان کا موجودہ تنظیمی ڈھانچہ فرسودہ ہے اور جمہوری ملک میں جس کام کی توقع اس سے رکھی جاتی ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس کے پاس ضروری سامان نہیں ہے موجودہ انتظامی اور مالی پابندیاں اس کی کارکردگی میں مزاحمت کر رہی ہیں اور قومی مقاصد حاصل کرنے کے لیے اس کی صلاحیت پر بری طرح اثر انداز ہو رہی ہیں ایک ایسے ادارہ کو جس کی سرگرمیاں زیادہ تر تخلیقی ہوتی ہیں حکومت کے محض ایک محکمہ کے خطوط پر نہیں چلایا جا سکتا۔ ہم نے اس امر پر سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کیا ہے۔

21 اپریل 1972

(اسلام آباد، نیشنل براڈ کاسٹنگ ہاؤس کا افتتاح)

6 نومبر 1972 کو راولپنڈی میں ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت صدر پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے فرمائی۔ اطلاعات اور ابلاغ عامہ کے ذرائع کو زیادہ موثر اور مفید بنانے کے بارے میں پالیسیوں کا تعین کیا گیا اور ان پر کسی تاخیر کے بغیر عمل درآمد کرنے پر زور دیا گیا۔ ساتھ ہی ریڈیو پاکستان کو 20 دسمبر 1972 سے قانونی طور پر کارپوریشن میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ریڈیو پاکستان کا نام 20 دسمبر 1972 سے **پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن ہوگا**

# عالمی سروس کا افتتاح

## صدر مملکت کا خطاب

21 اپریل 1973 کو صدر مملکت جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کی عالمی سروس کا افتتاح فرمایا۔ اس طرح نشریات کے ادارے نے ترقی کی جانب ایک اور قدم بڑھایا ہے، اس سروس کے آغاز سے ہماری اکسٹرنل سروس کے پروگرام اور زیادہ موثر ہو گئے اور ان کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

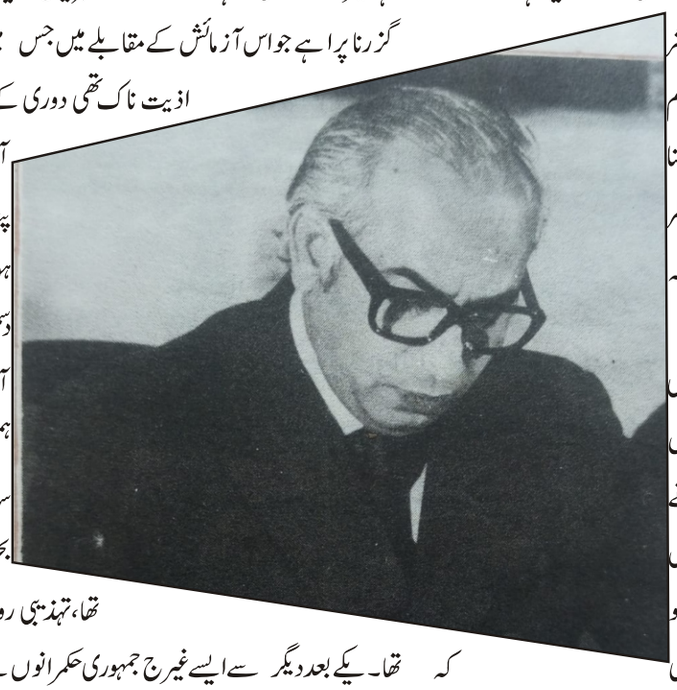

عالمی سروس کے پروگرام اردو اور انگریزی میں نشر کئے جاتے ہیں اس کا مقصد بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کو پاکستان کے حالا ت سے باخبر رکھنا اور غیر پاکستانی سننے والوں کو پاکستان کے نقطہ نظر سے آگاہ کرنا ہے، صدر پاکستان کی افتتاحیہ تقریر کا متن پیش ہے۔

پاکستانی شہریو اور ساتھیو! مجھے خوشی ہے کہ آج میری آواز آپ تک اُن طاقتور شارٹ ویو ٹرانسمیٹر وں کے ذریعے پہنچ رہی ہے جو پاکستانی انجینیر وں نے اسلام آباد میں نصب کیئے ہیں میری تقریر سے اس نشریاتی سہولت کے باقاعدہ استعمال کا افتتاح ہو رہا ہے یہ بیک وقت مناسب بھی ہے اور برمحل بھی کہ ان ٹرانسمیٹر وں کا سب سے اہم استعمال دنیا بھر میں پھیلے ہور ہے پاکستانیوں کیلئے ریڈیو پاکستان کی اس ورلڈ سروس کا آغاز ہے پاکستانی بھائیو آج میں بہت خوشی اور فخر کے ساتھ آپ سے مخاطب ہوں کیونکہ میں اس ذریعے سے آپ تک مشکلات پر قابو پانے، امیدوں کو بحال کرنے اور بارگاہ الٰہی میں مانگی ہوئی دعاؤں کو شرف قبولیت حاصل ہونے کے بارے میں اپنا پیغام پہنچا سکتا ہوں۔ مجھے آپ کے اُن دکھوں اور اس تشویش کا احساس ہے جس کے ساتھ آپ پاکستان کی اس سخت کشمکش کو دیکھتے رہے جس سے وہ گزشتہ دو سال سے جارحیت کے بحران کا مقابلہ کرنے اور اپنی بقا کیلئے دوچار رہے، مجھے معلوم ہے آپ کی وطن سے دوری نے آپ کی فکر اور پریشانیوں میں شدت پیدا کر دی ہے اور آپ کی دعاؤں میں اضطراب اور بڑھ گیا ہے غیر ممالک میں رہنے والے ہمارے شہریوں کو ایک ایسی جانکاہ آزمائش سے گزرنا پڑا ہے جو اس آزمائش کے مقابلے میں جس میں سے گزرے کہیں زیادہ اذیت ناک تھی دوری کے باوجود مجھے یقین ہے کہ آپ سب کو ان مشکلات کا پتہ ہو گا اور آپ نہیں سمجھتے ہوں گے جو میری حکومت کو دسمبر 71 میں برسر اقتدار آنے پر ورثے میں ملی تھیں ہمیں ہر قدم پر قطعی بحران کا سامنا تھا یہ قومی تشخص کا بحران تھا سیاسی عمل کا بحران تھا، تہذیبی روایتوں اور قدروں کا بحران تھا۔ یکے بعد دیگر سے ایسے غیر جمہوری حکمرانوں نے جو اقتدار سے چمٹے رہنا چاہتے تھے ایک ایسی قوم کی دل، دہلا دینے والی وراثت چھوڑی جو کہ تقسیم ہو چکی تھی اور بے یقینی کے سمندر میں ڈگمگا رہی تھی۔ آج سترہ مہینوں کے بعد میں آپ سے ایک ایسی قوم کے بارے میں بات کر رہا ہوں جس کے سینے میں نئی امید موجزن ہے ہم ایک ایسے آئین سے سرفراز ہو رہے ہیں جس کے جمہوری، وفاقی اور اسلامی ہونے کا کامل اتفاق رائے سے پرجوش استقبال کیا جا رہا ہے یہ ایک ایسا آئین ہے جو منتخب شدہ عوامی نمائندوں کی متفقہ رائے سے ظہور میں آیا ہے سیاسی

ادارے پھر سے بحال ہو گئے ہیں اور ملک میں مقصدیت کا ایک نیا احساس جاری و ساری ہے ہم اس قابل نفرت بھی برائی کو پیچھے چھوڑتے جا رہے ہیں ظلم و استحصال کا وہ بوجھ جس کے نیچے ہمارے عوام صدیوں سے خاموشی کے ساتھ دکھ جھیلتے چلے آ رہے تھے اب ڈانواڈول ہے، اب ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ رہے ہیں جہاں پہنچنے سے پاکستان کے عوام کو عرصہ دراز سے باز رکھا گیا ہے میری حکومت نے جو کہ آپ کی اپنی حکومت ہے۔ پاکستان کے عوام کو ہمیشہ اس ملک کا عظیم وسیلہ اور اپنی طاقت کا سرچشمہ تسلیم کیا ہے۔ آخر کار اگرہم مایوسیوں کی وادی سے اُبھر رہے ہیں تو یہ محض ہمارے عوام کی جوانمردی اور ان کی وہ ناقابل تسخیر قوت ارادی ہے جس سے وہ بے انتہا مشکلوں اور مسلسل دشمنی کے باوجود پاکستان کے لئے لڑتے ہیں۔

پاکستان کی قوت، پاکستانی عوام ہیں۔ ہم تہیہ کر چکے ہیں کہ ہم ان کی زندگیوں کو شادمانی اور خوشحالی فراہم کریں گے انھیں قوی تر بنائیں گے تا کہ وہ ان کے دل، ان کا شعور گواہی دے کہ یہ ان کا اپنا پاکستان ہے، ان کے خوابوں کا پاکستان ہے۔ میرا اپنے ملک سے یہ وعدہ ہے، ایسا وعدہ جو آپ سب کے ساتھ بھی ہے خواہ آپ اس وسیع دنیا میں کہیں بھی رہتے ہوں اور کوئی بھی کام کرتے ہوں۔ آج ہم پاکستان میں یوم اقبال منا رہے ہیں اس تصور سے جو انہوں نے تابندہ الفاظ میں ہمیں عطا کیا تجدید عہد کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہو سکتا، انہوں نے مسلم معاشرے کی تعمیر نو کا خواب دیکھا تھا، ایک ایسے مخلص اور ترقی پذیر ملک ملت کے قوم کا خواب جو برصغیر کے مسلمانوں کی قدروں اور جوان ہمتی کا علم بردار ہوا، دو عشروں سے زائد مدت کے ٹھہراؤ اور کم کوشی کے بعد پھر سے حاصل ہونے والی توانائی کے ساتھ پاکستان بھر کے طول و عرض میں ہم بڑی جانفشانی سے اس عظیم تصور کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مجھے یہ امید ہے کہ غیر ممالک میں بسنے والے آپ لوگ جن کے لئے ریڈیو پاکستان کی یہ ورلڈ سروس اپنے وطن کے ساتھ ایک پیہم رابطے کا باعث بنے گی، پاکستان کی اس تعمیر نو کا یہ نیا پیغام ہر جگہ پہنچائیں گے ماضی کی آمریتوں سے ملنے والی سب سے زیادہ تکلیف دہ وراثتوں میں سے ایک وراثت پاکستان کا بیرونی ملکوں میں وقار کا مسئلہ ہے۔ ہمیں نہ صرف غلط سمجھا گیا ہے بلکہ ہمارے ساتھ بدسلوکی کی گئی ہے اور میں آپ سب سے یہی چاہوں گا کہ آپ تمام دنیا کے سامنے ایک نئے پاکستان کی سچی اور صاف تصویر پیش کرنے کے عظیم کام میں ہمارا ساتھ دیں۔ یہ تصویر ایک ایسی پرفخر اور مہذب قوم کی ہے جو جمہوری ترقی اور سماجی بہتری کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ ہم امن چاہتے ہیں مگر ہم غلامی کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ ہم دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں لیکن ہم جارحیت کی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ ہم ایک اعلیٰ ثقافتی روایت کے مالک ہیں اور اب ہم اس روایت کو تازہ دم کرنے میں مصروف ہیں اور ایک ایسی ترقی پذیر اسلامی مملکت کی تشکیل میں مشغول ہیں جو انسانیت کی اعلیٰ ترین قدروں کی عکاسی کرے گی۔ یہی رہ پیغام ہے جسے ریڈیو پاکستان کی ورلڈ سروس پہنچائے گی اور یہی وہ پیغام ہے جس کے پہنچانے کیلئے میں بیرون ملک رہنے والے تمام پاکستانیوں سے اُمیدیں وابستہ رکھتا ہوں خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں یا کوئی بھی کام کرتے ہوں۔

پاکستان زندہ باد۔

شکریہ آہنگ 1973

# سیکرٹیری اطلاعات ونشریات کا دورہ ریڈیو پاکستان کراچی

رپورٹ: الطاف پیرزادو

سیکرٹیری اطلاعات ونشریات محترمہ شاہیرہ شاہد نے گذشتہ ہفتے ریڈیو پاکستان کراچی کا دورہ کیا۔ عملے سے ملاقات کی۔ ان کے مسائل سنے اور ان کے فوری حل کی یقین دہانی کروائی۔

محترمہ شاہیرہ 21 مارچ ملک کے معاشی و مالی مرکز ساحل سمندر پر واقع کراچی شہر کے محمد علی جناح المعروف ایم اے جناح روڈ تاریخی عمارت میں واقع ریڈیو پاکستان کے پرانے براڈ کاسٹنگ ہاؤس پہنچیں اور عمارت کے مختلف حصوں کا جائزہ لیا۔ شعبہ پبلیکیشن اور پراجیکٹ سیل کے حکام سے ملاقات کی ان سے اپنے اپنے شعبوں سے متعلق کارکردگی کے بارے میں معلومات لیں۔ اس موقع پر انہیں بتایا گیا کے ریڈیو پاکستان کے گوادر اور خیر پور سمیت مختلف حصوں میں کام جاری ہے۔ انہیں بتایا گیا کے شعبہ اشاعت ایسی تاریخی عمارت سے اپنا کام سرانجام دیتا رہا ہے اور دے رہا ہے۔

یہاں سے ریڈیو پاکستان کا ماہنامہ رسالہ آہنگ نکلتا ہے۔ جبکہ اس پرانی عمارت میں آگ لگنے کے واقع کے بعد تمام دیگر شعبہ جات اور نشریات حسن اسکوئر یونیورسٹی روڈ پر واقع نیو براڈ کاسٹنگ ہاؤس منتقل کر دی گئی تھی۔

اسٹیشن ڈائریکٹر کراچی جناب محبوب سرور اور دیگر افسران سے ملاقات میں سکرٹیری اطلاعات ونشریات نے احکامات جاری کئے کہ پرانے براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی اس تاریخی عمارت کو کام کیلئے بروئے کار لایا جائے اور تمام نان آپریشنل عملہ اور مرحلہ وار نشریات نئی براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے اس پرانے براڈ کاسٹنگ ہاؤس منتقل کر دی جائے تا کہ اس کا بہتر سے بہتر استعمال یقینی ہو سکے۔

محترمہ شاہیرہ شاہد نے 22 مارچ بروز جمعہ نئے براد کاسٹنگ ہاؤس کا بھی دورہ کیا۔ آپ نے دورے کے دوران یونائیٹڈ اسٹاف آرگنائزیشن (سی بی اے) کی جانب سے دئے گئے استقبالیہ میں شرکت کی۔ جہاں پر انہیں ملازمین کے مسائل، کارکردگی اور ادارے کے کام سے متعلق آگاہی دی گئی۔

اپنے اعزاز میں دئے گئے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے سکیرٹیری اطلاعات ونشریات محترمہ شاہیرہ شاہد نے کہا کے ریڈیو ایک قومی اثاثہ اور اہم ادارہ ہے جس کے مسائل کا حل حکومت کی اولین ترجیحات میں شامل ہیں۔

انہوں نے کہا کے ادارے کے اثاثہ جات کو شفاف نمونے کے زیر استعمال لا کر اس ادارے کی ضروریات اور ملازمین کے مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔

محترمہ شاہیرہ شاہد نے بعد ازاں ریڈیو پاکستان میں واقع ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کارپوریشن اور آڈٹ بیورو آف سرکیولیشن (اے بی سی) کے دفاتر کا دورہ کیا، مسائل سنے اور مسائل کو فوری طور پر حل کرنے کے احکامات جاری کئے۔ سیکرٹیری اطلاعات و نشریات محترمہ شاہیرہ شاہد کو دورے کے دوران اسٹیشن ڈائریکٹر جناب محبوب سرور اور شعبہ پروگرا، شعبہ انجینئرنگ، شعبہ خبر، اکاؤنٹس اور ایڈمنسٹریشن کے سربراہوں نے اپنے اپنے شعبوں کے کام اور نوعیت اور کارکردگی سے متعلق بریفنگ دی، جبکہ انہیں نئے براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے اولڈ براڈ کاسٹنگ ہاؤس منتقل ہونے کے سلسلے میں کئے جانے والے انتظامات اور درکار وسائل سے متعلق بھی بریفنگ دی گئی۔

(حضرت سچل سرمستؒ کے 403ویں عرس مبارک کے سلسلے میں آہنگ کیلئے خصوصی تحریر)

# جنھن دل پیتا عشق دا جام
# سادل مست و مست مدام

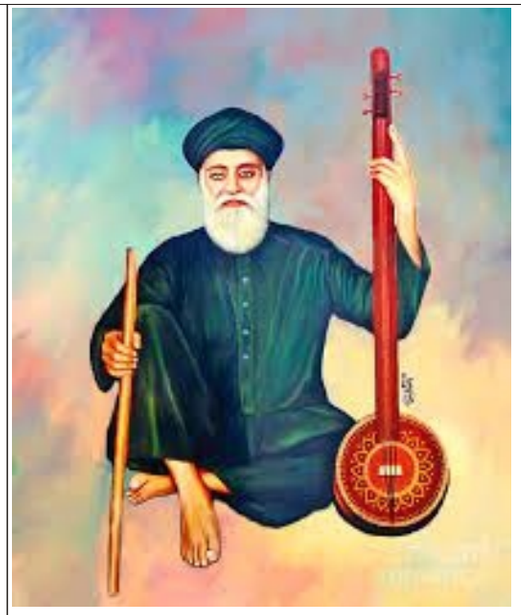

تحریر: سید اکبر علی شاہ
پی بی سی خیر پور

اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت، شانِ ذوالجلال بیان کرنے کیلئے دنیا میں نہ تو کسی کے پاس الفاظ ہیں نہ زبان جس سے ذکر کیا جاسکے۔ قرآن پاک واحد کتاب ہے جو مالکِ حقیقی کی شان بیان کرتی ہے۔ دوسری یا زبان امام الانبیاً خاتم النبین ﷺ ہے جو ان کی شان بیان کرنے کا حق ادا کرتی ہے۔ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کا ذکر بیان کرتی ہے پر اللہ تعالیٰ کے ولیوں نے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا ہے وہ بھی رہتی دنیا تک پیغام پہنچانے کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

حکمتِ خدا کے تحت پوری دنیا ایسے ولیوں کے وجود سے آراستہ ہے پر تخلیقِ کائنات سے لیکر عصرِ حاضر تک وادیِ مہران سندھ کی مانگ میں ایسے لاکھوں ستارے جگمگا رہے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے انداز سے پیامِ الٰہی پہنچایا ہے۔

اگر زمانۂ قدیم میں جاتے ہیں تو یہاں پر سندھ کے مقامی لوگ جنگ و جدل کے خلاف تھے ہمیشہ باہر سے حملہ آور یہاں کا امن تباہ کرنے آتے تھے۔ یہاں کے مقامی لوگ ہر اس مذہب کے پیروکار بن جاتے تھے جس میں سلامتی، امن اور انسانی ہمدردی کا پیغام ہوتا تھا۔ اب تک یہاں پر جین دھرم بدھ مت وغیرہ کو من وعن قبول کیا گیا۔

اسلام کے متعارف ہونے کے بعد یہاں کے عام لوگوں نے آسانی سے اسلام کو قبول کرلیا خصوصاً تصوف کا فکر یہاں کے باشندوں کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے پیاروں سے اپنی مرضی سے کام لیتے ہیں۔ مختلف ادوار میں کئی ولی اللہ یہاں تشریف لائے اور یہاں کے لوگوں کی روحانی آبیاری کی۔

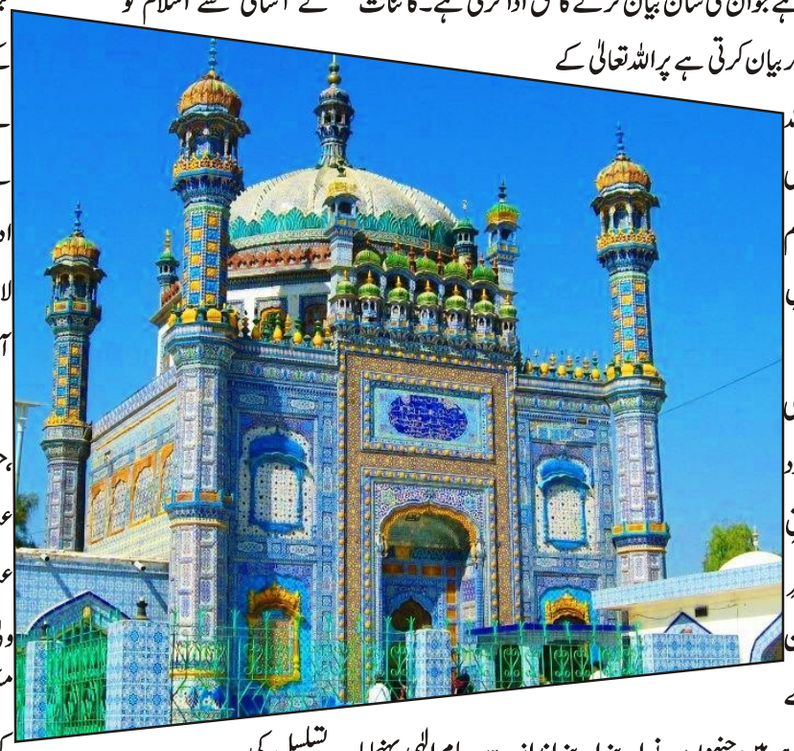

قلندر لعل شہباز، حضرت صدر الدین لکیاری، حضرت عبدالکریم بلڑی والے اور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی تک ہزاروں اللہ کے ولی بزرگوں نے وادیٔ مہران سندھ کو اپنا مسکن بنایا۔ حضرت سچل سرمستؒ بھی اسی تسلسل کی کڑی ہیں۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے جب سچل سرمستؒ کو کمسنی میں دیکھا تو فرمایا جو دیگ ہم نے پکانے کیلئے رکھی ہے اس کا ڈھکن یہ بچہ کھولے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ولی خاص ماحول وحالات میں پیدا ہوتے ہیں جب سچل سرمستؒ کی ولادت ہوئی اس وقت سندھ پر کلہوڑا خاندان کی حکمرانی تھی اس وقت سندھ چاروں اطراف سے خطروں میں گھرا ہوا تھا۔

افغانستان سے نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے سندھ پر حملے جاری تھے۔ یہاں سے لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے تھے اور تلواروں کو پر امن لوگوں کے خون سے تر کر کے جاتے تھے۔ سکھ بھی ہاتھ صاف کرنے کیلئے سندھ پر یلغار کرتے تھے۔ بیرونی حملہ آور تب تک کامیاب نہیں ہوتے جب تک اندرونی طور پر خلفشار نہ ہو۔ نتیجتاً عام آدمی تاراج تھا۔ ان حالات میں سچل سرمستؒ جیسے کھرے، سچے، نڈر بزرگ کا پیدا ہونا مشیتِ الٰہی کہا جاسکتا ہے۔

حضرت سچل سرمستؒ کا اصل نام خواجہ میاں عبدالوہاب تھا۔ آپ کا جنم 1152 ہجری بمطابق 1739 گاؤں درازا میں ہوا۔ آپ کے والد صاحب کا نام میاں خواجہ صلاح الدین فاروقی تھا۔ سچل سائیں کے دادا میاں صاحب ڈنو فاروقی بھی اپنے وقت کے درویش صفت عالم اور شاعر تھے۔ آپ ''موراگی'' کے لقب سے مشہور تھے۔ سچل سرمستؒ اپنے چچا میاں عبدالحق فاروقی سے بے حد متاثر تھے۔ ظاہری طور پر وہ ان کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ میاں عبدالحق فاروقی کی بیٹی سچل سرمستؒ کے عقد میں تھیں۔

سچل سائیں کم عمری سے ہی سچ گو تھے اسی لئے سچو اور سچل کے ناموں سے مشہور ہوگئے۔ بچپن میں ہی آپ حق گو اور حق کی جانب مائل تھے۔ 14 سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد راگ کے رنگ میں رنگتے گئے۔ آپ جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتے جارہے تھے تو آپ پر علم وعرفان کی منزلیں آشکار ہوتی جارہی تھیں۔

شروعات میں سچل سائیں اپنا کلام خود کہتے اور لکھتے تھے لیکن جیسے جیسے ان کے مزاج پر موج مستی اور وجد کی کیفیت طاری ہوتی گئی تو وہ طنبورہ پکڑ کر بے خودی کی کیفیت میں محوِ رقص ہوجاتے تھے۔ اپنی شاعری گاتے ناچتے ہوئے کرتے تھے۔ آنکھوں سے اشک جاری رہتے تھے۔ سچلؒ کی محفل میں حق موجود، سدا موجود کی صدائیں بلند ہوتی تھیں جو آج تک جاری ہیں۔

آپ کے طالب، عقیدت منداور فقیران کا کلام کہتے رہتے تھے۔ اسی طرح آپ کی بیاض تیار ہوتی رہیں۔ سچل سرمستؒ کی درج ذیل تصانیف مشہور ہیں۔

1۔ سچل سرمستؒ کا سندھی رسالہ۔ مرتب: عثمان علی انصاری
2۔ سچل سرمستؒ کا سرائیکی رسالہ۔
3۔ دیوان آشکار۔ (رازنامہ)
4۔ رہبرنامہ۔
5۔ گدازنامہ۔
6۔ تارنامہ۔
7۔ عشق نامہ۔
8۔ عاشقی الہام عرف سچلؒ کا کلام (نمانو فقیر)
9۔ رسالو سچل سرمستؒ۔ مرتب: رشید احمد لاشاری۔

ایک تحقیق کے مطابق سچل سرمستؒ نے تقریباً 9 لاکھ 36 ہزار 600 اشعار کہے ہیں۔

سچل سرمستؒ ہفت زباں شاعر کے طور پر بھی مشہور ہیں لیکن ان کا کلام سندھی، فارسی، پنجابی، سرائیکی اور اردو میں مل رہا ہے۔ وہ عربی اچھی طرح سمجھتے تھے اور آپ نے عربی کے الفاظ اپنی شاعری میں استعمال کئے ہیں۔ سچل سرمستؒ نے بیت، وائی، مولود (حضرت محمد ﷺ کی ولادت پر مبنی شاعری) کافی، مرثیہ، مداح، گھڑولی، جھولنا کے علاوہ کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔

سچل سرمستؒ اپنی شاعری میں عشق حقیقی کی منزل یوں بیان کرتے ہیں:

جب عشق میں سر نہیں دیا دو جگ بھیا تو کیا ہوا
ملا کتابیں کھول کر مسئلے پڑھا تو کیا ہوا
پڑھتا عمل کرتا نہیں عالم بنا تو کیا ہوا
جوگی جگت کرتا نہیں کپڑا رنگ تو کیا ہوا۔

سچل سرمستؒ منصور علاج کی راہ پر گامزن تھے۔ کہتے ہیں:

اینجھا کم کریجی جنھن وچ اللہ آپ بیٹجی
مار نعرا انا الحق دا ، سولی سر چڑھیجی

سچل سائیںؒ حسین بن منصور حلاج، شیخ فریدالدین عطار،

شیخ اکبر ابن العربی اور بایزید بسطامی کے زیرِ فکر تصوف پر مبنی شاعری کرتے تھے۔ سچل سائیں کے کلام میں جلال اور جمال جلوہ نمایاں ہوتا تھا۔

سچل سائیں کی شاعری خدا شناسی (توحیدالٰہی)، خودشناسی، حُبِ رسول اکرم ﷺ، حقیقت و معرفت، شریعت و طریقت اور حیات و کائنات کے اسرار و رموز کے علاوہ حق و صداقت، خلوص و محبت، ایثار و قربانی، ہمدردی و رواداری، عدل و انصاف اور اخوت و بھائی چارہ کا سرچشمہ ہے۔

سچل سرمستؒ کے صوفیانہ طریقت پر محققین کی مختلف آرا مل رہی ہیں۔ معروف سیاستدان و محقق جی ایم سید نے اپنی کتاب ''جنب گذاریم جن سین'' میں لکھتے ہیں کہ سچل سرمست کے آبا و اجداد حضرت بہاؤ الدین ذکریاؒ کے مرید تھے اسی وجہ سے ان کی سلسلۂ طریقت سہروردی تھا۔

ڈاکٹر تنویر عباسی اور مولانا دین محمد وفائی نے اپنی تحقیق سے سچل سرمستؒ کو سلسلۂ قادریہ سے جوڑا ہے۔ ان تمام تحقیقات پر جو سب سے زیادہ حاوی رائے نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت بہاؤ الدین ذکریا، حضرت لعل شہباز قلندر، بابا فرید شکر گنج اور سید جلال الدین بخاری، سرخ پوش اوچ شریف نے سلسلۂ سہروردی اور سلسلۂ چشتیہ کا خوبصورت امتزاج کر کے خواجہ معین الدین چشتی اور نظام الدین اولیاؒ کے طریقت پر وجدانی کیفیت میں سماع اور رقص کو رائج کیا۔ اسی وجہ سے تمام ولی اللہ اور بزرگان کو صوفیانہ طریقت سے پہچانا جا رہا ہے۔

صوفی فکر میں وسیع النظر کو فوقیت حاصل ہے۔ یہاں پر انسان کی عظمت کو اہمیت حاصل ہے۔ صوفی ہمیشہ تعصب، بغض اور نفرت کی نفی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف سلسلۂ طریقت اور غیر مسلم بھی صوفیا کرام کے عقیدتمند ہوتے ہیں۔

حضرت سچل سرمستؒ کہتے ہیں:

نا میں شیعہ، نا میں سُنی، نا میں سید سڈاواں
نا میں مرید نا میں پیر، سارے فقر کا فقیر
نا میں حاکم، نا میں ظالم، میں ہوں امن کا امیر

ایک اور موقع پر سچل سرمستؒ کہتے ہیں کہ:

عشق دے باجھوں بیا سبھ کوڑ، سولی تے منصور
نہ کوئی دوزخ نہ کوئی جنت، نہ کوئی حور، قصور

حضرت سچل سرمستؒ کا انتقال 14 رمضان المبارک 1212 ہجری بمطابق 11 اپریل 1827ء میں ہوا۔ سچل سائیں کا مقبرہ تالپور حکمراں میر رستم علی خان نے تعمیر کروایا۔





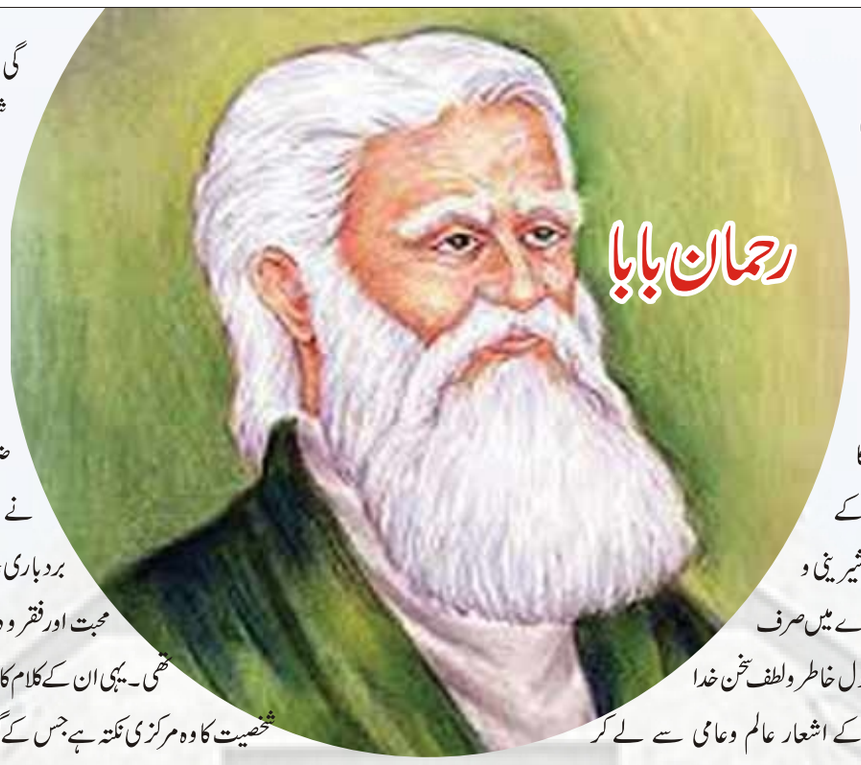


رحمان بابا۔۔۔۔

ایک صوفی شاعر رحمان بابا پشتو زبان کے عظیم شعرا میں سے ہیں۔ زبان کی پوری تاریخ میں کوئی دوسرا شاعر یا ادیب ان کی بے پناہ اور ہر دلعزیزی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے اشعار کو اللہ تعالی نے جو شیرینی و حلاوت بخشی اس کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ "بتول خاطر و لطف سخن خدا داد است "رحمان بابا کے اشعار عالم و عامی سے لے کر معاشرے کے ہر طبقے میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ یہ ان کی شاعری کا اعجاز ہی سمجھا جائے گا کہ ان کے شحر اور مصرعے آج بھی بطور ضرب الامثال استعمال ہوتے ہیں۔ رحمان بابا پشاور سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاں دیہہ بہادر کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی عمر ہی میں انہوں نے ضروری علوم حاصل کئے بعد میں پشاور ہی کے ایک دوسرے قریبی گاں ہزار خوانی منتقل ہو گئے۔ عمر عزیز کا ایک بیشتر حصہ وہیں گزارا وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ہزار خوانی کے قبرستان میں ان کی آخری آرام گاہ ہے۔ صوفیانہ مسلک رحمان بابا کی پہچان ہے۔ گوشہ نشینی، عزلت پسند درویش اور خدا مست، ان کی شخصیت کا یہ رنگ ان کے کلام کا ایک خاصہ بن گیا ہے اور ان کی شاعری پر بھی اس کا گہرا اثر ہے۔ رحمان بابا اگر دنیا کیکسی شاعر سے گہری مماثلت رکھتے ہیں تو وہ لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی ہیں۔ جس طرح خواجہ حافظ کی شاعری کے گرد تقدس کا ایک ہالہ پایا جاتا ہے اسی طرح رحمان بابا کے کلام کو بھی عوام کی عقیدت نے تقدس بخشی ہے۔ حافظ کے اشعار جس طرح زندگی کی مختلف کیفیات اور حیات انسانی کے گوناگوں گوشوں اور مسائل حیات کی وسعتوں اور پہنائیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فطرت انسانی کے کتنے بڑے رمز شناس اور مدوجزر حیات کے کتنے بڑے نباض تھے۔ یہی حال رحمان بابا کا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کوئی موقع کوئی مقام ہو دونوں کے اشعار بڑی خوبصورتی سے استعمال ہوتے ہیں۔ رحمان بابا عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کی لطافتوں اور رعنائیوں کے قصیدہ خواں ہیں۔ کیفیات حسن و عشق کی جو ترجمانی انہوں نے کی ہے۔ اس کی جھلک صرف فارسی کے قدیم اساتذہ کی غزلوں میں ہی مل سکے گی۔ رحمان بابا ایک پرسوز شخصیت اور گداز دل کے مالک تھے۔ چنانچہ قلب و جان کا یہ سوز و ساز اور جگر گدازی ان کے اشعار کی ابدیت کی ضمانت بن گئی ہے۔ عشق نے انہیں قناعت، تحمل، بردباری، اخلاق عالیہ، عالمگیر محبت اور فقر و درویشی کی نعمت عطا کی تھی۔ یہی ان کے کلام کا پیغام ہے اور یہی ان کی شخصیت کا وہ مرکزی نکتہ ہے جس کے گرد ان کی پوری شاعری گردش کرتی ہے۔ اپنی شاعری میں رحمان بابا نے اخوت کی عالمگیری کا پیغام دیا ہے، ان کے ایک شحر کا ترجمہ کچھ یوں ہے "میں عاشق ہوں میرا تحلق صرف عشق سے ہیمیں نہ خلیل ہوں نہ مہمند اور نہ داودزئیوں سے تحلق رکھتا ہوں اس شعر میں وہ نام و نسب کی تفریق کو مسترد کرتے ہوئے عالمگیریت کا درس دیتے ہیں۔ انہیں اپنی قلندری اور عاشقی پر ناز ہے۔ چنانچہ فرمایا "اے رحمان مجھے جو دولت عشق حاصل ہیاس نیدنیا کی ہر دولت سے مجھے بینیاز کر دیا ہے "رحمان بابا برصغیر پاک و ہند کے صوفی شعرا کے سلسلے کی ایک زریں کڑی ہیں جس میں حضرت سلطان باھو رحمتہ اللہ اور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی جیسی شخصیات شامل ہیں۔ یہ سب بزرگ اسلام کی ابدی تعلیمات کے امین اور دنیا کو محبت کا درس دینے والے تھے۔ ان کا پیغام محبت تھا، پیغام اخوت تھا۔ ہمارے لئے ان بزرگ صوفی شعرا کا کلام اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے جو ہمیں نسل، رنگ اور قومیت میں تقسیم ہو جانے سے روک کر ایک لڑی اور ایک رشتہ میں پرو دینا چاہتا ہے۔ رحمان بابا جب یہ کہتے ہیں تو انہی بزرگوں کی گویا ہمنوائی کر رہے ہوتے ہیں کہ "تمام انسان فی الحقیقت ایک واحد جسم کی طرح ہیں جو شخص دوسروں کو ستائے گا خود بھی ستایا جائے گا" اگر کوئی تجھ سے برائی کرتا ہے تو تو اس کے ساتھ بھلائی کر۔ اس لئے کہ جو درخت پھل دیتا ہے اس پر پتھر برسائے جاتے ہیں "انسانیت کو پرکھنے کا معیار دولت نہیں۔ بت اگر سونے کا بھی بن جائے تو انسان نہیں کہلا سکتا"

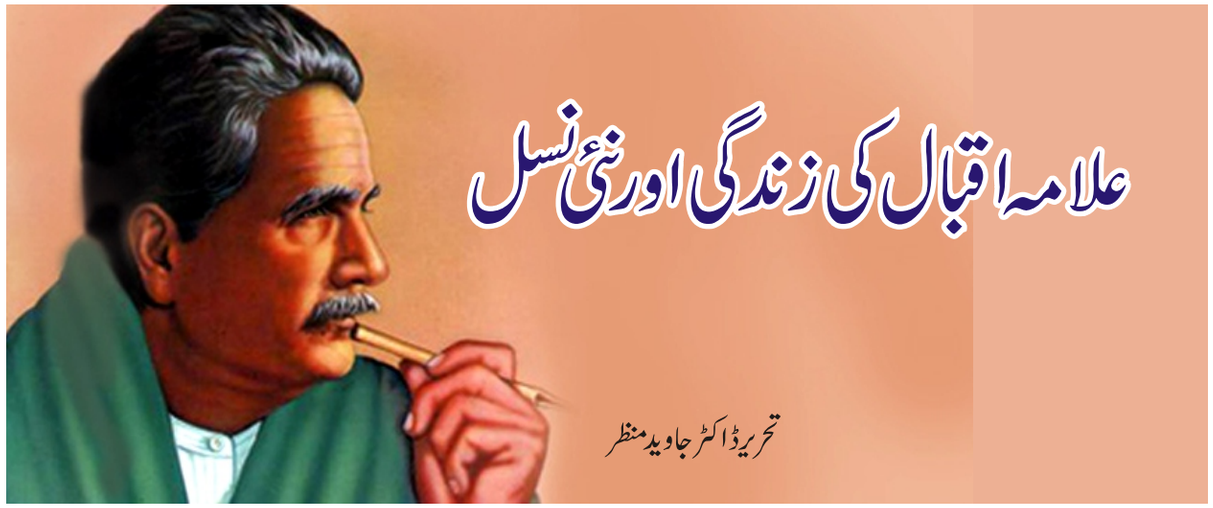

# علامہ اقبال کی زندگی اور نئی نسل

تحریر ڈاکٹر جاوید منظر

علامہ اقبال نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ان کی تمام زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے آپ ترجمان حقیقت، مصور پاکستان، شاعر مشرق اور مرد قلندر کی حیثیت سے ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔علامہ اقبال نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ نئی نسل کی تربیت کے لیے وقف کر دیا۔علامہ اقبال کے آباؤ اجداد کشمیری برہمن تھے، ان کے والد شیخ نور محمد کی ولادت 1837 میں اور وفات 1930 میں ہوئی اور والدہ امام بی بی 1915 میں وفات پا گئیں۔علامہ اقبال کے دادا کشمیر سے ہجرت کے بعد سترویں صدی عیسوی میں سیالکوٹ میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہی ان کا خاندان مشرف با اسلام ہوا۔علامہ اقبال نومبر 1877 بامطابق تین 3 ذیقعد 1294 میں پیدا ہوئے۔

علامہ اقبال نے تعلیم کو زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت دی 1893 میں میٹرکس کو اج مشن ہائی سکولز کے سیالکوٹ سے پاس کیا انٹرمیڈیٹ سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کیا۔انٹرمیڈیٹ سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے 1895 میں کیا۔1897 میں بی اے اور 1899 میں ایم اے کیا گورنمنٹ بار ایٹ لا 1908 میں کیمبرج یونیورسٹی انگلستان سے مکمل کیا جبکہ ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری 1933 میں پنجاب یونیورسٹی نے عطا کی۔

علامہ اقبال انتہائی خوش قسمت انسان تھے کہ انہیں اس دور کے بہترین اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔بعض اہم اساتذہ میں شمس العلماء، مولانا سید میر حسن، مرزا داغ دہلوی، مولانا غلام قادر گرانی، پروفیسر ٹامس آرنلڈ، پروفیسر رویگے ناسٹ ہائیڈرل، برگ جرمنی، 1907 اور پروفیسر فراڈلنگ سین ہائیڈل برگ جرمنی 1907 شامل تھے۔

علامہ اقبال کی درس و تدریس سے وابستگی بھی ان کی زندگی کا اہم حوالہ ہے 1899 میں اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے ریڈر مقرر ہوئے۔1901 میں اسلامیہ کالج لاہور میں اپنی ملازمت پر واپس آ گئے۔1903 میں گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنی ملازمت پر واپس آ گئے۔ 1903 میں گورنمنٹ کالج لاہور میں چھ ماہ تک انگریزی پڑھائی 1903 میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے سسٹم پروفیسر مقرر ہوئے 1908 میں کچھ عرصے لندن یونیورسٹی میں عربی کے استاد رہے، 1909 میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کی قائم مقام پہ پروفیسر مقرر ہوئے 1918 میں اسلام اے فلسفے کے طلبہ کو پڑھایا۔علامہ اقبال نے مختلف ممالک کا سفر کیا اور برصغیر کے مختلف شہروں میں بھی گئے جہاں انہیں آزاد خطابات ملے۔تعلیم حاصل کی اور علمی ادبی اور سیاسی کانفرنس میں شرکت کی آج علامہ اقبال کی تحریر اور شخصیت کے حوالے سے بہت سے ادارے قائم ہو چکے ہیں جن میں علامہ اقبال اکیڈمی لاہور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے علاوہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے جس میں طالب علموں کی بڑی تعداد زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو رہی ہے۔اس کا مرکزی کیمپس پاکستان کے دارالخلاف اسلام آباد میں ہے، جبکہ پاکستان کے کئی شہروں میں اس یونیورسٹی کے کیمپس قائم ہیں۔

اگر کسی سے یہ لکھنے کو کہا جائے کہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے ادیب و شاعر کا نام تحریر کریں تو وہ یقیناً علامہ اقبال ہی کا نام لکھے گا۔اہل علم و ادب کی متفق رائے ہیں کہ اٹارویں صدی میر تقی میر کی صدی ہے۔19 ویں صدی مرزا غالب کی فکر سے منسوب ہے، جبکہ بیسویں صدی علامہ اقبال کی مرہون منت ہے۔ مجھے جب کبھی بھی علامہ اقبال کے کسی بھی زاویہ نگاہ کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے تو میں آہنگی نو، فکرِ جدید اور جہان علم و ادب کے اس مثلث سے رجوع کرتا ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ اس بارے میں کبھی بھی مایوسی کا شکار نہیں ہوا۔

علامہ اقبال کی طرز تحریر اپنے جداگانہ اسلوب کے باعث ہر دور میں قارئین علم و ادب کی تعداد میں دن بدن اضافے کا باعث بن رہی ہے علامہ اقبال کی اسی انفرادیت نے ان کے کلام کو دنیا کی بیشتر زبانوں میں منتقل ہونے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔علامہ اقبال کی فکر نے ایسا پیغام دیا ہے جسے ہر دور کی نوجوان نسل کی ایک



بڑی تعداد میں دل و جان سے قبول کیا۔اسی باعث علامہ اقبال کو کہنا پڑا

ایک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکے بخارا و سمرقند

علامہ اقبال اس حقیقت سے آشنات ہیں کہ نوجوان نسل کی تعمیر ہی قوموں کی ترقی کی بنیادی ااس ہوتی ہے اسی لیے انہوں نے کہا ہے کہ

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

علامہ اقبال کی فکر ہی تھی جس نے ہمیں اس بات کی طرف راغب کیا کہ شاہین کی بلند پروازی اور نئی منزلوں کی دریافت اسے اپنے مقصد میں کامیاب و کامران کرتی ہے۔اقبال اپنی اس فکر کو یوں شعری قالب میں ڈالتے ہیں

آقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر اتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

علامہ اقبال نے جب نوجوانوں کو سال پسند، آرام طلب دیکھا تو وہ انتہائی افسردہ اور دل گرفتا ہوئے اور مغرب کی تہذیب سے نوجوانوں کی قربت کے رویے دیکھے تو علامہ اقبال نے مغرب نوازی کی کھل کر مخالفت کا رویہ اپناتے ہوئے اس بات کا اپنی شاعری میں یوں اظہار کیا۔

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے، تیرے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

علامہ اقبال نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی کہا

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کو قوم کی تعمیر کے لیے وقف کر دیا۔یہی نہیں بلکہ اہل علم و دانش کو یہ بھی بتا دیا کہ قوم میں نوجوان بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور علامہ اقبال اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ نوجوان ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے کبھی پستی کی طرف نہیں جاتا بلکہ اپنے حوصلے اور جواہمت ہی کے سبق اپنی منزل پر بے خطر پہنچ جاتا ہے۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم ہے اگر تو نہیں خطرہ افتاد

ہر دور میں علامہ اقبال کی فکر تازہ نے دنیا کے باور کروایا کہ نوجوان نسل کبھی مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں نہیں گر سکتی۔علی گڑھ کی تحریک اور قیام پاکستان کی بنیادی وجہ علامہ اقبال کا وہ کلام ہے جس نے تن مردہ میں جان ڈالتے ہوئے اور آزادی کا پروانہ دیتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ نئی نسل ہی دراصل مستقبل کی اثاث ہے۔نئی نسل کی تعمیر ہی قوم کو منزل نے آشنا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے نوجوانوں کو روشن مستقبل کی یوں نوید دی

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پہ
چمن اور بھی، آسماں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

علامہ اقبال نے اس عالمی رنگ و بو میں ماضی کے اوراق کو پڑھتے ہوئے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک ایسا پیغام دیا کہ ہرنا کامی یا مشکل راہ دراصل کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ایسے حالات میں پس ہمت نہیں ہونا چاہیے۔

تُندی باد مخالف سے نہ گھبرا، اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

دنیائے علم و ادب کے یہ مرد آہن 21 اپریل 1938 کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

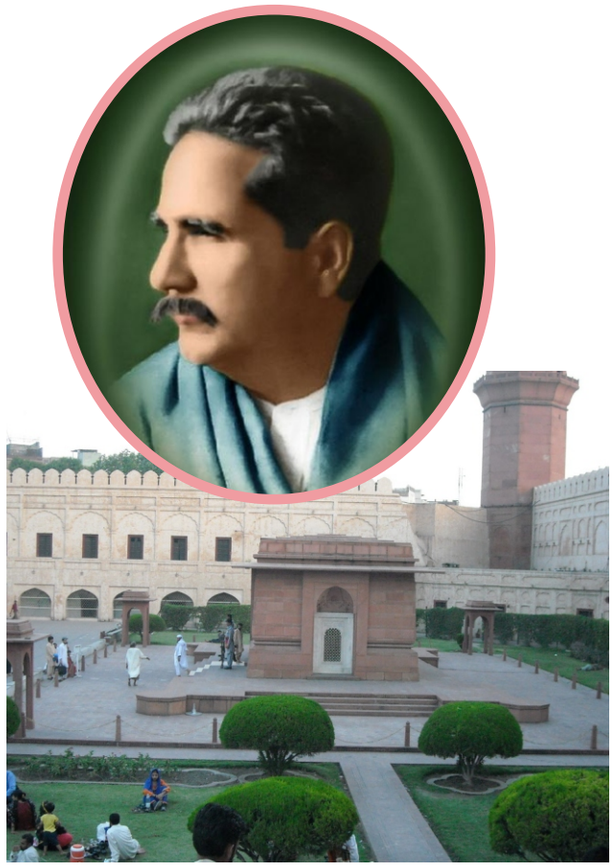

ہے یہی میری نماز، یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے جگر کا لہو

# قرآن پاک سے متعلق علامہ اقبالؒ کے خیالات

## نظریات اور واقعات قارئین کی نذر

## علامہ اقبال ایک عظیم شاعر

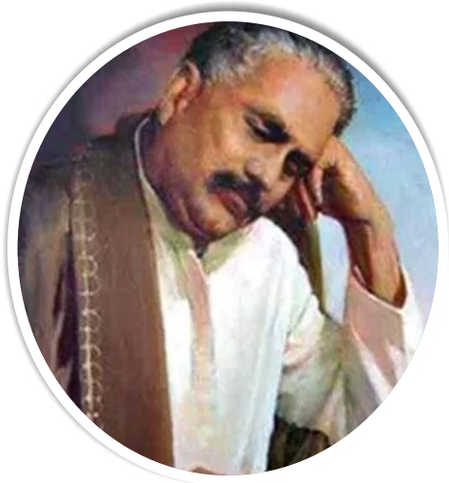

تحریر و تحقیق: افشاں نگار

علامہ اقبالؒ کا شمار ان فرزندانِ اسلام میں ہوتا ہے جو ملتِ اسلامیہ کو خدا کی طرف سے عطا ہوتے ہیں۔ اقبال شاعرِ مشرق تھے، ترجمان خودی و بے خودی تھے، عدم اسرارِ حیات، تھے، غلاموں کیلئے آزادی کا پیغام اور کاروان ملتِ بیضا کے وہ ہدی خواں تھے جن کی نوائے جگر سوز نے محکوموں کو آزادی کا یقین دلایا۔ آپ نے خوابِ غفلت میں مدہوش مسلمانوں کو جگایا۔ علامہ اقبال کا عشقِ حقیقی اور عشقِ محمد ﷺ سے والہانہ محبت کا اظہار ان کے کلام میں بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

زندگی راز عمل ساماں نبود — پس مرا ایں آرزو شایاں نبود
شرم از اظہار او آید مرا — شفقتِ تو جرأت افزاید مرا
ہست شانِ رحمت گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز

حضور ﷺ کی بارگاہ میں سراپا ادب بن کر حجاز میں مرنے کی آرزو کرتے ہیں۔ یہی ان کی اصل آرزو ہے اور یہی ان کی حیات جاودانی کا راز ہے۔ عشقِ رسول ﷺ اور قرآن مجید ہی سے علامہ اقبالؔ کے شخصی عناصر کی تعمیر ہوئی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی علامہ اقبالؒ سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ

''سفر کابل کی واپسی میں قندھار کا ریگستانی میدان طے ہو چکا تھا اور سندھ و بلوچستان کے پہاڑوں پر ہماری موٹریں دوڑ رہی تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ ہم دونوں ایک ہی موٹر میں بیٹھے تھے روحانیات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اربابِ دل کا تذکرہ تھا اور انہوں نے بڑے تاثر کے ساتھ اپنی زندگی کے دو واقعے بیان کئے۔ میرے خیال میں یہ دونوں واقعے ان کی زندگی کے سارے کارناموں کی اصل بنیاد تھے۔ فرمایا۔

''جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنی نماز اور وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھ کو دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح وہ میرے پاس سے گزرے تو مسکرا کر فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار دفعہ بتانے کا تقاضا کیا تو فرمایا، جب امتحان دے لوگے ،تب جب امتحان دے چکا اور لاہور سے گھر آیا تو فرمایا، جب پاس ہو جاؤ گے۔ جب پاس ہو گیا اور پوچھا تو فرمایا بتاؤں گا۔ ایک دن صبح کو حسبِ دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آ گئے اور فرمایا بیٹا کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو سمجھو کہ قرآن تم ہی پر اترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے۔ ڈاکٹر اقبال کہتے تھے کہ ان کا یہ فقرہ میرے دل میں اتر گیا تھا اور اس کی لذت دل میں اب تک محسوس کرتا ہوں۔ یہ تھا وہ بیج جو اقبال کے دل میں بویا گیا اور جس کی تناور شاخیں پہنائے عالم میں ان کے موزوں کلاموں کی شکل میں پھیلی ہیں۔

علامہ سلمان ندوی کہتے ہیں کہ ''باپ نے ایک دن بیٹے سے کہا کہ میں نے تمہارے پڑھانے میں جو محنت کی ہے، تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ لائق بیٹے نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ باپ نے کہا، کسی موقع پر بتاؤں گا۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا۔ بات ختم ہو گئی۔ علامہ اقبالؒ کہتے تھے کہ اسکے بعد میں نے لاہور میں کام شروع کیا۔ ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا پھیلا اور نوجوانوں نے اس کو اسلام کا ترانہ بنایا، لوگوں نے نظموں کو ذوق وشوق سے پڑھا اور سنا، سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا، انہی دنوں میں میرے والد بے حد بیمار ہوئے۔ میں ان کو دیکھنے کیلئے لاہور سے آیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ والد بزرگوار، آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا، وہ پورا کیا، یا نہیں؟ باپ نے بسترِ مرگ پر شہادت دی، کہ جانِ من، تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا ہے''۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ اقبالؔ نے ساری عمر جو پیغام ہم کو سنایا وہ انہی دو منتوں کی شرح تھی۔ علامہ اقبال اپنے مشہور و معروف خطابت میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ صوفیہ اسلام میں ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب تک مومن کے دل میں بھی کتاب (قرآن حکیم) کا نزول ویسا ہی نہ ہو جائے جیسا کہ آنحضرت ﷺ پر ہوا تھا، اسے سمجھنا محال ہے''۔ یہ قول ان کی اپنی زندگی کے ایک واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب علامہ اقبال سیالکوٹ میں زیرِ تعلیم تھے تو صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ایک دن اسی دوران میں ان کے والد محترم ان کے پاس آئے اور فرمایا، جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمہارے قلب اقدس پر نازل ہوا تھا، تلاوت کا مزہ نہیں، اس واقعہ کو علامہ اقبالؒ نے ''بالِ جبریل میں اس طرح ادا کیا ہے،

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؒ نہ صاحبِ کشاف

علامہ اقبالؒ فرماتے تھے کہ ''جب میں ایف اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد صاحب مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا، کبھی جاری ہوتی، ایک دن آ کر پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھتے تھے؟ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آ گیا۔ چھ مہینے ہو گئے ہر روز دیکھتے تھے کہ قرآنِ کریم پڑھتا ہوں، پھر یہ سوال کیسا؟ نہایت نرمی سے فرمایا، میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ میں بھی آتا ہے۔ اب میرا غصہ اور استعجاب جاتا رہا اور کہا، کچھ عربی جانتا ہوں، کہیں کہیں سمجھ میں آ جاتا ہے۔ بات ختم ہو گئی۔ کوئی چھ ماہ ایک دن بیٹھ گئے اور فرمایا، بیٹا قرآن پاک اسکی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر نازل ہوتا ہے۔ میں حیران تھا کہ کیا نبی ﷺ کے بعد قرآن پاک کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔۔۔۔ فرمایا، یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآنِ کریم حضورِ انور ﷺ کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ میں پھر حیران ہوا تو فرمایا، انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمد ﷺ کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک ہر نبی میں ''محمد ﷺ'' ہی کے مختلف مدارج تھے۔ وہ سلسلے گویا تکمیل محمد ﷺ کے منازل تھے۔ بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا البتہ شعورِ انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ''محمد ﷺ'' مکمل ہو گیا اور بابِ نبوت بند ہو گیا۔ انسانیت اپنی معراجِ کبریٰ تک پہنچ گئی اب ہر انسان کے سامنے معراجِ انسانیت کا نمونہ محمد ﷺ موجود ہیں۔ کوئی انسان جتنا محمدیت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اتنا ہی قرآن اس پر نازل ہوتا جاتا ہے۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا کہ قرآن کریم اسکی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔''

رئیس الاطباء حکیم محمد حسن قرشی ایک جگہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

''قرآن پاک سے علامہ اقبالؒ کو بیحد شغف تھا۔ وہ بچپن سے بلند آواز سے قرآن پڑھنے کے عادی تھے۔ قرآنِ حکیم پڑھتے ہوئے وہ بے حد متاثر معلوم ہوتے تھے۔ بیماری میں آواز بیٹھ جانے کا انہیں سب سے زیادہ قلق یہ تھا کہ وہ قرآن پاک بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے۔ بیماری کے دنوں میں بھی جب کبھی کسی نے قرآن حکیم کو خوش الحانی سے پڑھا تو آنسو جاری ہو گئے اور ان پر لرزش اور اہتزاز کی کیفیت طاری ہو گئی'' علامہ اقبال کلام پاک کی خاص دل سوزی اور شغف کے ساتھ تلاوت کیا کرتے تھے پڑھتے جاتے اور روتے جاتے، حتیٰ کہ اوراق مصحف تر ہو جاتے اور پھر ان کو دھوپ میں سکھایا جاتا۔ آپ کی تلاوت کا خاص قرآن پاک اسلامیہ کالج لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

مرزا جلال الدین بیرسٹر کہتے ہیں کہ

''علامہ اقبالؔ کی مطالبِ قرآنی پر ہمیشہ نظر رہتی تھی۔ کلام پاک کو پڑھتے تو اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے بلکہ نماز کے دوران میں جب بآواز بلند پڑھتے تو وہ آیاتِ قرآنی پر فکر کرتے اور ان سے متاثر ہو کر رو پڑتے۔ بیرسٹر جلال الدین کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کی آواز میں ایک خاص کشش تھی۔ جب وہ قرآن پاک آواز بلند پڑھتے تو سننے والوں کا دل پگھل جاتا'' علامہ اقبالؒ کے ملازم علی بخش کا کہنا ہے کہ ''صبح کی نماز اور قرآن خوانی مدت سے ان کا معمول تھا۔ آواز ایسی شیریں تھی کہ ان کی زبان سے قرآن سن کر پتھروں کے دل پانی ہو جاتے تھے۔ بیماری کے زمانے میں قرآن پڑھنا چھوٹ گیا تھا۔ نماز بھی کم پڑھتے تھے۔ کچھ عرصہ پیشتر مجھ سے کہنے لگے، علی بخش! میرا جی چاہتا ہے کہ آج نماز پڑھوں۔ میں نے کہا آپ پلنگ پر بیٹھ جایئے۔ میں آپ کو وہیں بیٹھے بیٹھے وضو کرا دیتا ہوں، وضو کر چکے تو میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب میں نے مہر صاحب کو بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ خدا جانے کیا بات ہے، کہنے لگے، ہاں مجبوری کی حالت میں یہ بھی جائز ہے،'' جن دنوں ہم بھاٹی دروازے میں رہتے تھے، دو مہینے بڑی باقاعدگی سے تہجد کی نماز پڑھتے رہے، ان دنوں ان کا عجب حال تھا، قرآن اس خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے تھے کہ جی چاہتا تھا بس سارے کام کاج چھوڑ کر انہی کے پاس بیٹھا رہوں۔ اس زمانے میں کھانا پینا بھی چھوٹ گیا تھا۔ صرف شام کو تھوڑا سا دودھ پی لیا کرتے تھے خدا جانے اس میں کیا رمز تھی۔''

علامہ اقبالؒ فرماتے تھے کہ اسلام کی تمام تعلیمات کا سرچشمہ قرآن پاک ہے ان کا اس بات پر بہت دل کڑھتا تھا کہ قوم نے اس نعمت سے صحیح فائدہ حاصل نہیں کیا۔ علامہ اقبال نے اپنے پیام میں قرآن کو پڑھنے اور اس سے نورِ ہدایت حاصل کرنے پر بڑا زور دیا ہے۔ ایک خط میں اکبر الہ آبادی کو لکھا کہ۔

''واعظ قرآن بننے کی اہلیت تو مجھ میں نہیں ہے۔ ہاں اس مطالعے سے اپنا اطمینانِ خاطر روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔''

سخن میں سوزِ الٰہی کہاں سے آتا ہے
یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو گداز کرے

حوالہ کتاب: اقبال اور قرآن
مصنف: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، بشکریہ نیشنل لائبریری، اسلام آباد

عبداللہ خوب صورت نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں کھو یا اٹھکھیلیاں کرتے بادلوں اور اونچے اُڑتے شاہینوں کے مانند پرندوں کو بغور دیکھ رہا تھا کہ ایک بزرگ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر متوجہ ہوا۔ بزرگ کی وضع قطع سے ثروت چھلک رہی تھی اور بردباری ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ ان کے چہرے کی طمانیت نے عبداللہ کو بھی خوش گوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھاما اور قریب ایک جگہ کو صاف دیکھ کر انہیں بیٹھا دیا۔

عبداللہ: السلام علیکم جناب محترم

بزرگ: وعلیکم السلام میرے بچے اجیتے رہو۔ ماشاءاللہ! اچھے گھرانے کے چشم و چراغ معلوم ہوتے ہو۔ کہاں رہتے ہو؟

عبداللہ: محترم! میں قریب ہی ایک گاؤں سے تعلق رکھتا ہوں معاف کیجیے، مجھے لگتا ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے، البتہ میری یادداشت اس وقت میرا ساتھ نہیں دے رہی۔ اس وقت مجھے ایک کش مکش نے آن گھیرا ہے۔ آپ کا اس طرح دیکھ کر مسکرانا یقیناً میرے لیے بھی خوشی کا باعث ہے، مگر میں اب بھی اسی پس وپیش میں مبتلا ہوں کہ کیا معاملہ ہے؟ بزرگ بیٹے اسکرا کر مانا تو صدقہ ہے (پھر کچھ دیر توقف کے بعد

اچھا یہ بتاؤ، کیا کرتے ہو؟''

عبداللہ: جی! میں انجینئر کی سند حاصل کرنے کے بعد کم وبیش ایک سال سے نوکری کی تلاش میں ہوں، مگر شاید اس ملک میں میرے لیے کچھ نہیں۔ میرے جیسے کئی لوگ تو دفتروں کے چکر لگا کر اپنی جوتیاں ہی چٹاتے پھر رہے ہیں، اور ایک مناسب نوکری کی لاحاصل تگ ودو کے بعد کئی نوجوان مایوس ہو کر باہر جانے پر مجبور ہیں۔

بزرگ: نہایت افسردہ لہجے میں) اچھا! تو بیٹے پھر آپ نے کیا ارادہ کیا ہے؟"

عبداللہ: میرا بھی اب کچھ ایسا ہی ارادہ ہے کہ کسی اور ملک میں اپنے لیے کوئی روزگار تلاش کروں، مگر باہر جانا بھی ایسا آسان کام نہیں ایجنٹس کافی زیادہ پیسے مانگتے ہیں"۔

بزرگ: تو بیٹے! آپ کے پاس جتنا سرمایہ ہے، اس سے کیوں اپنا کوئی ذاتی کاروبار نہیں کرتے۔ ویسے بھی تجارت تو میرے نبی کی سنت ہے"۔ عبداللہ:"جناب مجھے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر کاروبار میں پیسہ لگانے جاؤں تو کہیں سب کچھ اپنے ہاتھ ہی سے نہ گنوا بیٹھوں"۔ عبداللہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بزرگ کے سوالات کا جواب کیوں دیے جارہا ہے۔ وہ جانا چاہتا تھا مگر ایک ان دیکھی طاقت اس کے پیروں کو جکڑے ہوئے تھی۔

بزرگ: ''بیٹا! کاروبار اللہ پر توکل کو بڑھاتا ہے، تو کیا آپ نہیں چاہیں گے کہ آپ اللہ پر اپنے توکل اور بھروسے کو اور مضبوط کریں؟

عبداللہ: توکل تو مجھے اپنے اللہ پر بے حد ہے اور اسی بھروسے اس پاک ذات پر





ایمان رکھتا ہوں''۔

بزرگ: کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہے، بیٹے!

عبداللہ: میں سمجھا نہیں۔

بزرگ: علامہ اقبال کو جانتے ہو؟"

عبداللہ: جی! کورس کی کتابوں میں ان کے اشعار کا مطالعہ کیا ہے۔ بزرگ بس بیٹا یہی تو معاملہ ہے۔ اقبال کو پڑھنے اور ان کے افکار کو جاننے میں بہت فرق ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اقبال کا شاہین کون ہے؟

عبداللہ: جی! نوجوان کو علامہ اقبال نے شاہین کہا ہے، مگر کیوں؟

میں سمجھنے سے اب تک قاصر ہوں۔ زرگ محض نوجوانوں کو نہیں، بیٹا تخلیقی صلاحیتوں سے آراستہ نوجوانوں کو۔ بات جاری رکھتے ہوئے بزرگ بولے) پیارے بیٹے!

اقبال کا نوجوان وہ شاہین ہے جو اپنا مقام خود بناتا ہے:

وہی جہاں ہے ترا، جس کو تو کرے پیدا یہ سنگ وخشت نہیں، جو تری نگاہ میں ہے"

عبداللہ: محترم علامہ اقبال نے نوجوان کو شاہین ہی سے نسبت کیوں دی؟ اور اگر اقبال کے مطابق شناخت اور مقام ہی مقصود ہے تو کنول کا پھول تو وحدانیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ایک گندے جوہڑ میں رہ کر بھی وہ اپنی شناخت اور خوب صورتی کو برقرار رکھتا ہے"۔

عبداللہ: شاید اب اپنی علمی توجیح کو پیش کر کے بزرگ کے سامنے سرخ رو ہونا چاہتا تھا۔

بزرگ: بیٹے کنول کا پھول سکونت کو ظاہر کرتا ہے، جبکہ علمی زندگی میں انسان کو قدم قدم چلنا پڑتا ہے۔ شاہین انتہائی ذہین وفطین پرندہ ہے۔ اپنی تیز نظر اور اپنے اوپر آنے والی مشکلات سے نکلنے کا ہنر جانتا ہے۔ جانتے ہو بیٹے شاہین گھنے بادلوں سے ڈر کر چھپتا نہیں بلکہ ان سے اوپر نکل کر اُڑتا ہے شاہین کی خصوصیات کیا ہیں، اس کی نوجوانوں کے لیے مثال پیش کرنے کی اقبال کے پاس چند اور اہم وجوہ بھی ہیں۔ وہ بلند پرواز رکھتا ہے، تیز نگاہ رکھتا ہے کبھی مردار نہیں کھاتا، انتہائی دور اندیش ہے، اپنا آشیانہ نہیں بناتا:

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں

کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

عبداللہ: آشیانہ نہ بنانے میں کیسی درویشی؟

بزرگ: بیٹا! آشیانے سے مراد یہ ہے کہ شاہین سختیاں جھیلنے اور مصائب سے لڑنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ چھپ کر اپنا رزق تلاش نہیں کرتا بلکہ اپنے شکار کے تعاقب میں ہر مشکل سے لڑنا جانتا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر تو آپ نے یقیناً سنا ہوگا:

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ بیاباں میں

کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کار آشیاں بندی

پھر وہ اپنے نوجوانوں کا حوصلہ یہ کہہ کر بڑھاتے ہیں:

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں

کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

عبداللہ: بالکل بجا فرمایا۔

بزرگ: تو بیٹے انہی مشکلات کے بھنور سے اپنے نوجوانوں کو نکالنے کے لیے علامہ اقبال نے خودی کی قوت سے مالا مال ہونے کی ترغیب دی ہے:

خودی ہو زندہ تو فقر بھی ہے شہنشاہی

نہیں ہے سنجر وطغرل سے کم شکوہ فقیر

عبداللہ: تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی خودی کی حفاظت کرتے ہوئے اس کیفیت سے سرشار ہو کر آگے بڑھنا ہے"۔: بزرگ بالکل اقبال کا نوجوان ہی اصل میں مرد مومن اور مرد آہن ہے جو دور اندیش ہے اور وسوسوں کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتا، وہ ناممکن کو ممکن بناتا ہے۔ اسی خواہش میں علامہ اقبال آپ کو معلوم ہے، اپنے نوجوانوں کے لیے کیا کہتے ہیں؟

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی

ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد

ناچیز جہانِ مہ وپروین ترے آگے وہ عالم مجبور ہے، تو عالم آزاد

عبداللہ: مسکراتے ہوئے) لگتا ہے، آپ حضرت علامہ اقبال کو بہت پسند فرماتے ہیں۔ وہ بے شک مشرق کے عظیم شاعر تھے۔

بزرگ: میرے بیٹے! ہمارا مسئلہ ہی یہی ہے کہ ہم آج تک علامہ اقبال کو ایک شاعر سے زیادہ سمجھ ہی نہ پائے، اور محض مشرق کے نہیں ان کی شاعری دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے ہے۔ صد حیف! جو لوگ حقائق میں تھے ان کی تعلیمات عام لوگوں تک پہنچ ہی نہ پائیں۔ (پھر مسکرائے اور کچھ دیر توقف کے بعد بولے بیٹے علامہ اقبال کا کلام ہر دور کے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ذکر کر کے ان کے نہ صرف جذبات کو ابھارا اور یک جا کرنے کی کوشش کی بلکہ انھیں تجدید ایمان کی بھی ترغیب دی:

دل زندہ وبیدار اگر ہو تو بتدریج

بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور

عبداللہ: جناب! نہایت ادب کے ساتھ، مگر ان سب باتوں کے تناظر میں میری نوکری کا کیا تعلق؟

عبداللہ: شاید اب بزرگ کی باتوں سے اکتانے لگا تھا۔

بزرگ: بیٹے! رزق اللہ کے ہاں لکھا جا چکا ہے، اس کے لیے پریشان ہونا یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ سے ہماری نسبت محض زبانتک ہے۔

عبداللہ: تو آپ ہی بتایئے، ہم اپنے اللہ پر یقین کیسے پختہ کریں؟ کیسے خود کو دنیوی فکر سے آزاد کریں؟''

بزرگ: بیٹے! علامہ اقبال کے نزدیک ہماری بے عملی ہے جس نے ہمیں اللہ سے دور کر دیا ہے۔ ہمارے آباواجداد کمال اوج کو پہنچے، کیونکہ وہ اللہ پر خاص یقین رکھتے تھے، ان کی عبادات اور نماز خالصتاً اللہ کے لیے تھی میرے نزدیک ہم اللہ کو تو مانتے ہیں مگر اس کی ایک نہیں مانتے اور وجہ شاید یہ ہے کہ ہم دن میں اپنی نماز میں بارہا اللہ اکبر" تو کہتے ہیں مگر اس کی کبریائی کا اپنے مکمل وجود کے ساتھ اقرار نہیں کرتے اگر نہ ایسے کیسے ممکن ہے جسے ہم ہر لحاظ سے بزرگ و برتر سمجھیں، وہ ہمیں دنیوی فکر سے آزاد نہ کرے، مگر اس کیا یک شرط ہے"۔

عبداللہ: وہ کیا ہے؟ محترم

بزرگ:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب وخاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب

اور پھر زندگی گزارنے کا ایک گوہر نایاب علامہ اقبال کے اس شعر سے بھی جھلکتا ہے:

ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

عبداللہ: کیا جناب! اپنی اس بات کی مزید وضاحت مرحمت فرمائیں گے؟''

بزرگ: اگر آپ اپنی حاجات صرف اللہ کے حضور رکھیں تو آپ کو اپنی مرضی کسی اور کے پاس نہ لے جانی پڑے۔ بس اس بات کا مکمل یقین کر لیں کہ حاجت روا صرف اللہ ہے اور اس دنیا کی ہر شے اس ذاتِ باری تعالیٰ کی مطیع ہے۔ بیٹا! سچ کہوں، اقبال امید کے پیامبر تھے۔ انھوں نے ایک مایوس قوم کو امید کی کرن دکھائی۔ انھوں نے اسلام کو سمجھنے اور اس کے مطابق عملی زندگی میں آگے بڑھنے کے اصول بتائے۔ اقبال فرماتے ہیں: اگر آج اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود بربادی اور ہلاکت سے محفوظ ہو جائے گا۔

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم وعرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

عبداللہ: محترم! میں آپ کی کہی ہر بات سے اتفاق کرتا ہوں میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ناامیدی کفر ہے، مگر رزق کے حصول کے لیے کوشش کرنا ناامیدی کو تو ظاہر نہیں کرتا؟

بزرگ: بیٹا کوشش ہر معاملے میں ضروری ہے، مگر کوشش میں یہ یقین بھی شامل ہونا ضروری ہے کہ صرف اللہ ہی مسبب الاسباب ہے تبھی اس کوشش میں برکت آتی ہے۔

عبداللہ: تو کیا میں آپ کی بات سے یہ سمجھوں کہ آج کا نوجوان اپنی پوری کوشش نہیں کرتا؟ عبداللہ خود کو اب الجھا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

بزرگ: بیٹے! پہلے تو یہ طے کرنا بہت ضروری ہے کہ آپ اپنی کوشش کے ساتھ اللہ پر کامل یقین بھی رکھتے ہیں کہ صرف وہی رازق اور مالک ہے کیونکہ یہ یقین ہی آپ کو رزق کی فکر سے آزاد کرتا ہے۔

عبداللہ: (مسکراتے ہوئے) کیا آپ اسی طرح لوگوں سے ملتے اور اقبال کا پیغام سناتے ہیں؟ عبداللہ کو اپنے جوابات مل گئے تھے۔ اب وہ قدرے پرسکون تھا۔

بزرگ: ہاں! تو کیوں نہیں، اقبال کی شاعری کا خاصہ نوجوان کے گرد ہی تو گھومتا ہے۔ وہ نوجوانوں سے محبت کرتے تھے، اور میں ان کا پیغام ان جوانوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں جو کسی نہ کسی وجہ سے مایوسی کا شکار ہیں جیسے کہ آپ روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہیں یا پھر ایسے نوجوانوں کو جو اقبال کے افکار سے صحیح طور سے آگاہ نہیں ہیں۔

عبداللہ: آپ سے مل کر میرے احساسات کو بہت تقویت ملی ہے کم از کم میں اب خود کو پرسکون محسوس کر رہا ہوں، اور میری بھی یہ کوشش ہوگی کہ میں اقبال کے افکار کو اچھے طریقے سے سمجھوں اور اپنے جیسے مایوسی میں گھرے لوگوں کے لیے رہ نمائی کا ذریعہ بنوں، مگر آپ سے اجازت لینے سے پہلے کیا آپ کا نام جان سکتا ہوں۔

بزرگ: علامہ محمد اقبال، یہ کہہ کر وہ چل دیئے۔

عبداللہ: یہ سن کر چونک اٹھا۔ تو گویا جن سے وہ مخاطب تھا، وہ کوئی اور نہیں خود حضرت علامہ اقبال تھے۔ دھندلاہٹ اب ختم ہو چکی تھی، دماغ کے دریچے بھی اب کھلنے لگے تھے۔ وہ انھیں عقب سے آواز دینا ہی چاہتا تھا کہ فجر کی اذان کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ موذن کی فجر کی اذان میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی، اور میں وہ عبداللہ تھا جو اس کہانی کو اپنے اندر سمو رہا تھا حتی الالفلاح'' کا مطلب بھی اب بخوبی اندر سے آ رہا تھا۔ وضو کرتے وقت میں اپنے دل میں ساتھ ساتھ یہ نیت بھی کر رہا تھا کہ نہ صرف میں نماز کو پورے خلوص نیت سے پڑھوں بلکہ اس کا اپنے پورے وجود سے اقرار بھی کروں کہ اللہ ہی رازق اور مالک ہے اور اقبال کا شاہین بن کر ہی دنیا کی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

# آغا حشر سٹیج ڈراموں کے موجد اور خاتم

تحریر: سبین حیات

آغا حشر کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ اُردو ڈراموں میں انہیں جو امتیاز حاصل ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ آغا حشر کو اُردو ڈرامہ نگاری میں وہی مقام حاصل ہے جو میرؔ اور غالبؔ کو شاعری میں حاصل ہے۔ اگر انگلستان شکسپیئر پر فخر کر سکتا ہے تو ہمیں آغا حشر کی شخصیت پر ناز ہے۔ آغا حشر نے نہ صرف برصغیر کے اسٹیج ڈراموں کو کامیاب بنایا بلکہ قدیم تھیٹر کیلئے ترقی یافتہ اردو ڈرامے لکھ کر ڈرامہ نگاروں کیلئے نئی راہیں کھولیں۔ آغا حشر کو اردو ہندی دونوں زبانوں پر بے مثال قدرت حاصل تھی۔ ان کے مکالموں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا روزِ بیان ہے۔ اردو سٹیج ڈراموں میں اشعار اور گانوں کی بھرمار پائی جاتی تھی۔ دربار میں گانا، جنگل کا گانا، خلوت و جلوت میں گانا، خوشی، غمی پر گانا۔ ہر کردار میں ہر وقت گانا ہی نظر آتا تھا۔ بے شک کہ آغا حشر کے ڈرامے بھی ان سے پاک نہیں تھے لیکن انہوں نے رفتہ رفتہ ان غیر ضروری گانوں اور طویل ترین اشعاروں کو اپنے ڈراموں میں کم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے تدریجی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنے تصنیفی ادوار میں مختلف زبانوں میں ترقی کی منزلیں طے کر کے اردو ڈرامے کو قدامت کی پستی سے نکال کر بڑی حد تک بلندی پر پہنچا دیا۔ گانوں کی جگہ اشعار کے استعمال سے جدت و قدرت کے دلکش انداز رائج کئے۔ اس طرح ان کے آخری ڈراموں میں اس قسم کی غلطیاں نہیں پائی جاتیں۔ آغا حشر اسٹیج ڈراموں کے ایک بڑے مصلح اور مخصوص اسلوب نگارش کے موجد اور خاتم تھے، آغا حشر کا ڈرامہ ''خوابِ ہستی'' قدیم وجدید دونوں انداز کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ ''خوابِ ہستی'' آغا حشر کو اپنے اس عہد کے تمام ڈراموں میں بہت مرغوب اور مطبوع تھا۔ کئی بار خود آغا حشر نے اس کی نظر ثانی کی۔ متعدد کمپنیوں نے ہزار ہا مرتبہ تمثیل کیا۔ پلاٹ کی دلکشی کے علاوہ اس ڈرامے کے پُر زور اور برجستہ مکالمے، اشعار اور گانے نہایت اعلیٰ اور لطیف ہیں۔

خوابِ ہستی سے اقتباس ملاحظہ ہو

پہلا سین

رضیہ: چچا جان آپ بھائی صولت سے اس قدر کیوں ناراض ہیں؟

نواب: بیٹی رضیہ! کیا کہوں۔ آج کل کے نوجوان مسلمانوں کی عجب حالت ہے۔ والدین کی دولت پاتے ہی یہ رقص وسرور کی محفلوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ حلال حرام کی تمیز نہیں رکھتے۔ کسی محسن کو بھی عزیز نہیں رکھتے۔

رضیہ: اب آپ نے صولت کو کیا نصیحت کی؟

نواب: میں کیا نصیحت کر سکتا ہوں، خدا ہی اس پر رحم کرے۔

رضیہ: افسوس! ایک شریف زادہ ہو کر ایسے افعالِ بد کا مرتکب ہوا اور بزرگوں کی رسوائی کا سبب ہو۔

نواب: میں صرف صولت کی وجہ سے اس قابل نہیں رہا کہ شہر میں کسی کو منہ دکھاؤں۔ کسی تقریب میں جو جاتا ہوں تو کسی اور نام سے۔ اس نالائق نے اپنے ساتھ مجھے بھی بدنام کر دیا ہے۔

رضیہ: چچا جان! اس معاملے میں مجھے آپ سے ازحد ہمدردی ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ بھائی جان کی طبیعت کچھ عجیب واقع ہوئی ہے۔

نواب: پیاری بیٹی! میں چاہتا ہوں کہ اپنی جائیداد تیرے نام پر ہبہ کر دوں اور اس ناعاقبت اندیش کو تمام جائیداد سے عاق کر دوں۔

رضیہ: نہیں! چچا جان یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بھائی جان کے ہوتے ہوئے ایسا کبھی نہ کروں گی۔ یہ بدنامی کبھی نہ لوں گی۔

نواب: نہیں نہیں رضیہ! میں بخوشی تمام لکھ دوں گا کیوں کہ مجھے امید ہے کہ صولت میری موت کے بعد کل جائیداد عیاشی میں اڑائے گا۔ کنبے کے ہر ایک فرد کو ستائے گا۔

رضیہ: جو جناب کی مرضی۔ مگر میں یہ رائے آپ کو کبھی نہیں دے سکتی کہ آپ ایسا کریں۔

نواب: خیر دیکھا جائے گا۔ وہ دیکھو وہ نالائق سامنے آرہا ہے۔ پھر کچھ ضرورت ہوگی۔ لئے آیا ہے جو کئی دنوں کے بعد منحوس نے پھر چہرہ دکھایا ہے۔

رضیہ: چچا جان! میں جاتی ہوں۔ آپ بھائی جان کو نرمی سے سمجھائیں۔ ان بد کاریوں سے باز آجائیں، شائد راہ پر آجائیں اور اپنے کئے پر پچھتائیں۔

(رضیہ کا جانا اور صولت کا آنا)

**سین نمبر 2**

نواب اعظم: شرم کر! شرم کر! بے غیرتی کے پتلے

شریروں کے شر سے بُروں کے اثر سے جفا سے دغا سے خطا سے بھرا ہے

جفا کار عیار مکار موذی فرشتے سے شیطان پیدا ہوا ہے

نہ قدرِ محبت نہ پاس شرافت نہ توقیر عزت نہ شرم وحیا ہے

برائی کا بندہ طبیعت کا گندا نہ دنیا کی عزت نہ خوفِ خدا ہے

صولت: بس جناب بس! اتنی سختی بھی نہ کیجئے۔ جو مجھے سخت جواب دینے کی ضرورت پڑے۔ آپ کی ان باتوں سے طبیعت ابلتی ہے۔ یاد رکھئے! پتھر پر پتھر جب گرتا ہے تو دونوں سے چنگاری نکلتی ہے۔

نواب: اگر لعنت سے اتنا ڈرتا ہے تو فضحیتا اور عباسی جو جیتی جاگتی لعنت ہیں ان سے کیوں نہیں پرہیز کرتا ہے۔ یہ ریاست کے گھن ہیں۔ ان سے پرہیز کیوں نہیں کرتا۔

**سین نمبر 4**

(صولت کا کمرہ)

گانا، شعر وشاعری۔ حُسنا صولت کو اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے۔

صولت: اوہ! چپ رہو۔ سب کو زبانی دعویٰ ہوتا ہے۔ کون کس کیلئے جان کھوتا ہے

مشکل ہے ساتھ دے کوئی حالِ تباہ میں

سایہ بھی چھوڑ جاتا ہے روزِ سیاہ میں

حُسنا: صولت میرا عشق وفادار ہے۔

صولت: میری حُسنا! یہ دشوار ہے

حُسنا: مجھے آزماؤ

صولت: ہاں لو۔ یہ جعلی وصیت نامہ ہے۔ اسے رکھ کر کسی طرح میرے باپ کی تجوری سے اصلی وصیت نامہ نکال لاؤ۔

کسوٹی اب بتادے گی کہ کیا کیا تم سے ہونا ہے

یہ چمکیلا سنہرا عشق پیتل ہے کہ سونا ہے

حُسنا: او خدا یہ تو مجھے چوری کرنے کیلئے کہتا ہے۔۔۔۔ نہیں نہیں صولت تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔

صولت: سرد ہوگئی۔ زرد ہوگئی۔ عشق کا بخار اتر گیا۔ محبت کا جوش مر گیا۔

راہِ وفا میں دو ہی قدم چل کر گر گئی

کیا جان دے گی تُو جو زباں دے کے پھر گئی

حُسنا: زباں دی تھی کہ تم پر جان دوں گی جان حاضر ہے

کہا تھا سر کٹاؤں گی یہ سر اس کی آن حاضر ہے

میری دولت، محبت، جان و دل سب کچھ تمہارا ہے

نہ دوں گی میں مگر ایمان جوان سب سے پیارا ہے

صولت: آہ! قسمت، قسمت، امید کی روشنی بھی مجھے راستہ نہیں دکھاتی ہے۔

حُسنا: خدا اسے نیک راستہ دکھائے۔

☆☆☆

# اندھیری رات کی بارش

تم کولمبو چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور میں کراچی چلا آیا۔ نہ تم نے پھرانا پھرنا وطن کی ضبری اور نہ میں کراچی میں اپنے کاروباری جھمیلوں سے نکل سکا۔ میں کو د تمہیں ایک مدت کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ پچھلے دنوں میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کولمبو گیا ہوا تھا۔ جب پری ٹیکس ماؤنٹ لیونیا کے سامنے گال ہوٹل کے قرب سے گزری اور دور مجھے سمندر کے کنارے لہراتے نارمل کے جھنڈ دکھائی دیئے تو بے اختیار تم یاد آگئے ار پھر وہ رات یاد آگئی جس رات کولمبو کے مرطوب آسماں پر کوئی چاند نہیں تھا اور سمندر کا رنگ گہرا سبز تھا اور اس کی پرسکون لہریں ناریل کے بھیگے، خاموش سایوں میں دبے پاؤں آکر واپس چلی جاتی تھیں۔

تمہیں یاد ہوگا۔ ہم دونوں ماؤنٹ لیونیا کے ٹیرس پر بڑے بڑے پام کے گملوں کے پاس بیٹھے کافی پیا کرتے تھے۔ ہمارے پچھلے لیونیا مکب کے بڑے ہال میں سے آرگن کی ہلکی ہلکی لے کر تم میری طرف دیکھتے اور کہتے کہ بہار میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ مولسری کے پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور نیم کی شاخوں سے ٹوٹ کر گرے ہوئے سفید پھولوں کا فرش بچھ جاتا ہے۔ ہمیں ماؤنٹ لیونیا کی کافی بہت پسند تھی۔ ساحل ہمارے سامنے ناریل کے لہراتے درختوں کی ایک قوس بناتا ہوا دور تک چلا گیا تھا اور درختوں میں ان سنہالی لوگوں کی جھونپڑیاں تھیں جو اپنے بچوں کے ساتھ دن بھر وہاں ناریل کی چھال کی رسیاں بنا کرتے۔ ان ہی تاڑ، ناریل اور پام کے درختوں کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ کیا نہیں کبھی ماؤنٹ لیونیا کی کافی میں مولسری کی خوشبو آتی ہے؟

لیکن خیر میں جانتا ہوں تم آج بھی اپنی عادت کے مطابق مجھے جھڑک دو گے اور کہو گے مولسری کے پھول تو سب ہی کے لئے اگتے ہیں اور کافی بھی سری لنکا کے سبھی لوگ دیتے ہیں پھر اگر انہیں مولسری کی خوشبو نہیں آتی تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ تمہاری یہ باتیں مجھے اس وقت بھی یاد آرہی تھی ں جب میری ٹیکس گال فیس ہوٹل کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ تمہیں یاد رہے یہاں سے ایک راستہ سمندر کو جاتا تھا۔ وہ راستہ اب بھی اپنی جگہ سے سمندر کو جاتا ہے۔ میں نے وہاں ٹیکسی رکوائی اور اتر کر اسی راستے سے ہوتا سمندر تک گیا۔ میرے اوپر ناریل کے درختوں کی شاکوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ اور وہ جنوب مشرقی ہوا میں جھوم رہے تھے۔ سامنے سمندر تھا، سفید دھوپ میں چمکتا سبز سمندر اور اس کی جھاگ اڑاتی سفید لہریں۔ یہاں باہیں طرف درختوں کے ایک جھنڈ میں لیک چھوٹا سی معصوم سانولی لڑکی انناس بیچنے آیا کرتی تھی۔ تمہیں یاد رہے ایک روز ہم نے اسے انناس کھانے کو دیا تو اسے اپنی سہانی زبان میں کیا کہا۔ اگر میں نے انانس کھایا تو میری ماں مجھے گھر سے نکال دے گی۔ وہ خود بھی ایک چھوٹے سے ناریل کی طرح لگتی تھی۔ کیا یہ لوگ کو دانناس نہیں کھاتے؟ تم نے مجھ سے پوچھا تھا، کیونکہ میں ایک عرصہ سے کولمبو میں تھا اور ان لوگوں کی زبان جانتا تھا۔ میں نے نہیں بتایا تھا کہ یہ لڑکی اپنا رزق انناس بیچ کر حاصل کرتی ہے انناس اس کا رزق نہیں ہے۔

اب میری گاڑی بوریدجنکشن والے چوک سے گزر رہی تھی۔ مجھے دور سے مسز جونس کی کوٹھی الماس پیلس کے لان میں جھومتے ناریل کے ہرے بھرے درخت دکھائی دیئے۔ ہم اس کوٹھی کی ایک انیکسی میں بھی رہے تھے۔ انیکسی کے عقب میں درختوں کی بھرمار تھی۔ آم، انریل اور تاڑ کے درخت مسز جونس نے انیکسی کے برآمدے کے ستونوں پر استوائی بیلیں چڑھا رکھی تھیں۔ رات کو جب موسلا دھار بارش ہوتی تو ہم اس برآمدے میں چائے لے کر بیٹھ جاتے اور لاہور کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لاہور ہمیں کس شدت سے یاد آیا کرتا تھا۔

تمہیں وہ رات ضرور یاد ہوگی۔ کولمبو کا مطوب موسم آسمان سیاہ گھٹاؤں میں چھپا ہوا تھا۔ تم اور میں انا پورنا، ان کے عقب برآمدے میں بیٹھے تھے۔ تم اس کے لئے چائے بنا رہے تھے اور درختوں سے آتی کیلے کے پتوں کی مہک چائے کی کوشبو کے

ساتھ مل گئی تھی۔رات کی بارش کے سیاہ موتی اندھیرے میں کیلے کے چوڑے پتوں سے پھسل کر تمر ناری کے نیلے پھولوں پر گر رہے تھے اور تمہیں محسوس ہوا تھا کہ سری لنکا کے گہرے سبز سمندروں نے اپنے سارے موتی، لہروں کی طشتریوں میں بھر کر تمہارے پاس برآمدے میں رکھ دیئے ہوں۔جنگلوں کی ساری کوشبو میں سمنٹ کر چائے کے فلیور میں جذب ہوگئی ہوں اور بادلوں کی بیٹی، سمندروں کی بارش، بھیگے کنول، پھولوں کے تاج سر پر رکھے تمہارے سامنے بیٹی چائے پی رہی ہو۔

وہ رات تمہاری اہم کی ایک کواب آلود تصویر ہے۔میں نے دور سے اپنی انیکسی کی دھندلاتی چھت اور اس کے آگے جھکا ہوا دیکھا۔مسز جونس وہاں نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے دور سے ہاتھ ہلا کر آلمس پیلس کے ناریلوں کو سلام کیا اور آگے نکل گیا۔اب میں ٹمپل روڈ کی ٹرام ٹرین پر سے گزر رہا تھا۔اس کی رنگ آلود سبز دیواریں وہی ہی تھیں۔اور اس کی جالیوں میں سے اگر پتوں کی خوشبو کی پیٹل باہر نکل رہی تھیں۔زاد کپڑوں والے بھکشو بڑے ادب کے ساتھ سر جھکائے اندر داخل ہو رہے تھے۔میں نے پکوڈا کے عقب میں جا کر وہ درخت بھی دیکھا جہاں تم دونوں نے اپنے اپنا نام کھودا تھا۔میں نے تمہارے نام کی تلاش کرنے کی بہت کوشش کر مگر وہ مجھے کہیں نہ ملے

شاید اس لئے کہ درخت آگے بڑھ جاتے ہیں اور نام پیچھے رہ جاتے ہیں۔درخت کسی نام کو نہیں پہچانتے۔ایک گلہری درخت پر تیزی سے بھاگی۔ایک پتا ٹوٹ کر نیچے گرا۔میں نے اسے اٹھا کر درخت کے تنے کے پاس رکھا اور باہر نکل آیا۔ان پورنا کا گھر اب سامنے تھا۔مجھے اس کے گھر کے آنگن میں نیم کا درخت نظر آرہا تھا۔ ٹیکسیس رکوا کر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال بیک کا بٹن دبایا۔ایک اور ملازم نے دروازہ کھول کر پوچھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے؟ میں نے انا پورنا کے والد کا نم لیا تو اس نے یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا کہ وہ لوگ مدت ہوئی وہاں سے جا چکے ہیں۔

میرے دوست جیسے تم چائے بناتے ہو اس کا فلیور اڑ کر اسمان کی طرف پرواز کر جاتا ہے اسی طرح انا پورنا بھی سری لنکا کی خوشبو کی ایک لہر تھی جو کولمبو کے جنگلوں میں پرواز کر گئی ہے اب اگر تم ایک ہزار سال تک یہاں کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکتے پھرو جب بھی اس خوشبو کو واپس نہیں لاسکو گے.

اگلے روز میں رات کی فلائٹ سے واپس کراچی کی طرف روانہ ہوگیا یہ میں تمہارے لیے لکھ رہا ہوں کہ کولمبو کی خوبصورت یاد تمہاری امانت تھی جسے میں تم تک ضرور پہنچانا چاہتا تھا ستارے اب بھی چمکتے ہیں بارش اب بھی ہوتی ہے اسمان پر گھنگور گھٹائیں آج بھی چھا جاتی ہیں اور رات کے اندھیرے میں بارش کے سیاہ موتی کنول کی پنکھڑیوں پر محبت کی تحریریں پیار کے اداس گیت آج بھی مہکتے ہیں لیکن وہ موسلا دار بارشوں میں آدھی رات کو اٹھ کر انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں۔



# کمرہ نمبر 5 ڈرامہ

سید امتیاز علی تاج

منظر: یونیورسل ہوٹل کی عمارت میں واقع ایک پاگل خانے کا منظر فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

ڈاکٹر زاہد: جی، میں ڈاکٹر زاہد بول رہا ہوں مینٹل ہسپتال ہے۔جی ہاں پاگلوں کا یہی ہسپتال ہے جسے ایک امریکن ڈاکٹر نے کھولا ہے۔میں ان کا اسٹنٹ ہوں۔جی؟ جی۔جی ہاں۔اس وقت تو مشکل ہے۔جی دیکھیں نا اس وقت دس بجنے کو ہیں۔میرے گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔تھک بھی گیا ہوں اور پھر مریض کے آتے آتے نا معلوم کتنا وقت لگ جائے۔اس لئے آپ کل صبح کا وقت رکھیے۔ بالکل آرام سے۔یعنی اگر مریضوں کے آرام کا خیال نہ رکھا جاتا تو اس قسم کے ہسپتال کھولنے کا فائدہ کیا تھا۔جی ہاں۔جی ہاں بالکل۔ایسے مریض جو کسی کو ستاتے نہیں کھلے رکھے جاتے ہیں۔مکان اور احاطے میں بے تکلف گھومتے پھرتے ہیں۔ جی؟ عرض کیا نا اس وقت مشکل ہے۔مگر رات رات ہی کی تو بات ہے۔نہیں تو پھر ایک کام کیجئے کہ اگر دور شدید ہو جائے کہ مریض کو قابو میں رکھنا آپ کو ناممکن معلوم ہو تو مجبوری کو لے آئے گا میں کہہ جو دوں گا کہ مریض کو رات میں ہی داخل کر لیا جائے۔معائنہ البتہ صبح ہی ہو سکے گا۔ہاں۔جی ہاں۔جی یونیورسل ہوٹل۔بڑی ہی سفید رنگ کی عمارت۔جی ہاں وہی وہی۔پچھلے دنوں وہ ہوٹل یہاں سے اٹھ گیا ہے۔جی یہ ہسپتال ہوٹل کی عمارت میں کھولا گیا ہے۔جی۔جی کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ آپ کسی نگے والے سے اتنا کہہ دیجئے گا۔جی ہاں۔جی؟ پاگل خانہ نیا سنی ہوٹل تو یہاں بڑی مدت سے تھا۔آپ ہوٹل کا پوچھ لیتے۔اسے سب جانتے ہیں۔آداب عرض۔

(ڈاکٹر فون رکھ کر چپڑاسی کو آواز دیتا ہے)

چپڑاسی جی حضور

ڈاکٹر: دربان کو بھیجو۔

چپڑاسی: اسے بھیج کر میں گھر چلا جاؤں حضور؟

ڈاکٹر: ہاں آپ جا سکتے ہیں۔

دربان: سلام حضور۔

(دربان آتا ہے)

ڈاکٹر: دور بان! ہم اب گھر جا رہے ہیں۔ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ رات میں شاید ایک بیمار آجائے۔اگر آئے تو اسے داخل کر لینا۔اور روشن دین سے کہنا کہ کمرہ نمبر 15 سے دے دے۔روشن دین تھوڑی دیر بعد رات کی ڈیوٹی پر آجائیں گے۔

دربان: بہت اچھا حضور

ڈاکٹر: اور دیکھو کوئی ضرورت یا خاص مشکل پڑے تو OT والوں کو خبر دے دی جائے۔ورنہ صبح کے وقت مریض کو دیکھ لیں گے۔

دریان: بہت اچھا جناب

ڈاکٹر: خیال رکھنا کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

دربان نہیں حضور گڑبڑ کیا ہوگی۔

ڈاکٹر: اچھا تم دروازے پر جاؤ ہم اس پچھلے راستے سے جا رہے ہیں۔

دربان: بہت اچھا حضور

(ڈاکٹر جاتا ہے)

پاگل 1: اوہیلو۔او بات تو سنو۔ہمارے ڈرامے کا ایک سین تو دیکھتے جاؤ۔ارے سنا نہیں کیا جناب؟ لکہ معاش سے غم میں گرفتار ہیں؟

پاگل 2 لیکن ہم اس وقت تک اپنی آواز لگاتے رہیں گے جب تک ہماری آواز کی سنوائی نہ ہوگی۔

پاگل 3: اے نجد کے راہرو اب تم جاؤ اور آجاؤ کہ اپنے مجنوں کے نام پیغام بھیجنے کیلئے تجھے لیلی پکار رہی ہے۔

پاگل 2: آتو گیا اب کچھ کہو بھی۔

پری ہے کہ جنوں ہے کہ سایہ ہے تو

پرستان میں کیسے آیا ہے تو

پاگل 5: چل کے آیا ہوں حضور۔

پاگل 6: پھر تو تیرے پیروں میں آبلے پڑ گئے ہوں گے۔نبض دکھاؤ۔ بیشک۔ بیشک۔تو یہ چالیس روز تک ہماری اکسیر کسی مرہم میں لگا کر ان آبلوں پر لگا دیجئے گا۔

پاگل 2 لیکن اگر تو ہمارے اخبار کیلئے کسی جلسے کی رپورٹ یا مراسلہ لایا ہے تو اسے

پیشتر ہمارے حوالے کر دے۔ یا اپنے اخبار کی آخری کاپی ہم پولیس کے حوالے کر دیں۔

پاگل3: اور اتنا بتانا کہ اس صحرا کے سفر میں تو نے میرے مجنوں کو تو نہیں دیکھا؟ اُس مجنوں کو جس کے انتظار میں استانی بن کر برسوں میں مکتب عشق چلاتی رہی ہوں۔

دربان: ارے مجھے کیا پتا میں تو دربان ہوں۔ پہچانتے نہیں مجھے؟

گھنٹی بجتی ہے)

دربان: کوئی آیا ہے ذرا جا کر دیکھوں کون آیا ہے۔

پاگل4: ہائے جاتے کہاں ہو مجھے تو ٹھکانے لگا کے جاؤ مارا ہے جس کو اس کا جنازہ اٹھا کے جاؤ

دربان: ارے میرا ہاتھ چھوڑو۔

پاگل: 4 اللہ رے نزاکت، یہ نزاکت نہیں خالی جس طرح کہ لچکتی ہے کوئی پھولوں کی ڈالی

دربان: ارے باہر بیمار کھڑا ہے۔

پاگل6: بیمار؟ ارے چھوڑو۔ فی الفور چھوڑو۔ بیمار کو حکیم ابوالاکسیر کی ڈیوڑھی پر انتظار نہیں کروایا جاسکتا۔

پاگل3: وہ۔ میرا مجنوں تو نہیں؟

دربان: ارے۔ آپ سب اپنے کمروں میں آرام فرمائیں۔

پاگل4 آرام؟ آرام کیسا؟ سب نے آرام کھو دیا۔ غفلت نے سب تلف کیا قسمت نے جو دیا۔

پاگل6 حکیموں کی قسمت میں آرام نہیں لکھا ہے۔

پاگل7: ایڈیٹروں کی قسمت میں شب و روز خدمت گزاری۔

پاگل3 اور چاہنے والوں کے نصیب میں اختر شماری ہے۔ پاگل:4 اور ایکٹروں کے نصیب میں شب بیداری ہے۔

گھنٹی بجتی ہے)

دربان: معلوم بھی ہے کمبخت کون بجا رہا ہے؟ سپرنٹنڈنٹ صاحب ہیں۔ جا کر سو جاؤ نہیں تو وہ آ کر خفا ہوں گے۔ میں دروازہ کھولنے جا رہا ہوں۔

پاگل4: سپرنٹنڈنٹ صاحب آ گئی تو بھاگو بھیا۔

پاگل6 لگتا ہے باہر بیمار ہے۔

پاگل:3: چپ کر کے دیکھو۔

(کوئی اندر آتا ہے)

مہمان: اتنی دیر سے گھنٹی بجا رہا ہوں۔ سنتا نہیں۔ بہرہ ہے تو؟

دربان: حضور۔۔۔

مہمان مردوں سے شرط لگا کر سوتا ہے؟

دربان: آپ۔۔۔۔

مہمان اور سرِ شام یہ اندھیرا کیسا ہے؟

دربان: شام کیسی حضور اب تو رات کے دس بھی بج چکے۔

مہمان: ارے تو کیا رات کے دس بجے رات ہو جاتی ہے؟ اور تم لوگوں کے کاروبار کی رات میں یہاں کیس اسٹیشن پر ریلیں نہیں پہنچتیں؟ یہاں کے اڈوں پر لاریاں پہنچنا بند ہو جاتی ہیں؟ تم کو تو ساری ساری رات آنے والوں کی راہ دیکھنی چاہئے۔ یہ کیا طریقہ ہے کہ رات کے دس بجے رات ہو جاتی ہے۔

دربان اور کتنے بجے ہونی چاہئے حضور؟

مہمان: لاحول واللہ۔ یہ دروازے کھڑکیاں کیوں بند ہیں؟

دربان: دروازے کھڑکیاں بند ہی رکھنے کا حکم ہے۔

مہمان کس کا حکم ہے؟ شہر میں ڈاکے پڑنے لگے ہیں کیا؟

دربان: بڑے ڈاکٹر کا حکم ہے۔

مہمان: بڑے ڈاکٹر کا؟ اسے ڈاکٹر کس گدھے نے بنا دیا؟ اور تم لوگ ایسے ڈاکٹر کی سنتے ہی کیوں ہو جو کہتا ہے کہ ہر وقت دروازے کھڑکیاں بند رکھو؟

دربان: حضور یہاں داخل ہوئے تو نہیں آئے؟

مہمان: داخل ہوئے؟ کہاں کی اردو بولتے ہو؟ یہ کوئی سکول ہے جس میں داخل ہوتے ہیں؟

دربان: پھر کیسے تشریف لانا ہوا؟

مہمان: لوگ یہاں کس لئے تشریف لاتے ہیں؟

دربان پر تو ساتھ کوئی نہیں آیا آپ کے؟

مہمان: ساتھ بارات لے کر آنی تھی؟

دربان: میرا مطلب ہے کوئی پہنچانے نہیں آیا حضور کو؟

مہمان: پہنچانے کون؟ تمھارا کوئی ایجنٹ؟

دربان حضور کا کوئی رشتہ دار؟ یا کوئی دوست؟

مہمان: میں نے کہا کون سا نشہ کرتے ہو؟

دربان: اطلاع آپ ہی کی طرف سے تو نہیں تھی؟





مہمان: ارے اطلاع کے بچے۔ اطلاع آئی تھی یا نہیں آئی تھی یہ بتا ہمارے لئے کوئی کمرہ خالی ہے کہ نہیں؟

دربان: جی ہاں۔ کمرہ نمبر 5 آپ ہی کیلئے رکھا ہوا ہے۔ آپ یہاں ٹھہریں میں ابھی سب بندوبست کئے دیتا ہوں۔

مہمان! یہ ہو کیا گیا ہے یہاں۔ ماحول ہی بدل گیا ہے۔

دریان: بدل گیا ہے۔

مہمان: لیکن یہ بات بھی ہے کہ ہم ذکر ایک عرصے کا کر رہے ہیں۔ پچھلی بار جب ہم یہاں آئے تو بفضل خدا بہت کما کر گئے تھے۔ اس عرصے میں بڑی بڑی حیثیت کے لوگ یہاں اترے ہوئے تھے۔ اُن سب کی زندگی کا بیمہ کر لیا۔

دربان: زندگی کا کیا حضور؟

مہمان: ہم بیمہ کمپنی کے ایجنٹ ہیں۔

دربان: اوہ تو آپ کی دھن آنٹی ہے خیر ہے۔

مہمان! رہنے والے کہاں کے ہو؟

دربان! بجنور کا حضور

مہمان! زبان کہاں کی بولتے ہو؟

دربان: زبان یہاں کی بولتا ہوں حضور۔

مہمان منیجر کہاں ہے تمھارا؟

دربان: منیجر کونسا حضور؟

مہمان: بھئی یہاں کا انتظام کرنے والا۔

دربان: وہ تو بنگلے پر چلے گئے لیکن ضرورت پڑی تو بلا لئے جائیں گے۔ مہمان ہمیں ٹھہرنے کیلئے کمرہ دیں انھیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔

دربان: جی ہاں۔ آپ خیر و عافیت سے کمرے میں پہنچ جائیں تو پر واقع ہی میں بلانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کمرے کی بابت وہ مجھے سمجھا گئے ہیں۔

مہمان: تو جا کے کھول ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

دربان: میں نے کہا بیٹھے رہئے گا حضور۔ مہمان: اور کیا ہم اٹھ کے ناچنا شروع کر دیں گے؟

دربان یہاں تک بھی خیر ہے مگر اور کچھ تو۔۔۔۔

مہمان: اور میں نے کہا کچھ خلل ہے تیرے دماغ میں۔

دربان: حضور یہاں کے رہنے والے سب خلل میرے ہی دماغ میں بتاتے ہیں لیکن ہوتا اُن کے اپنے دماغ میں ہے۔

مہمان: منیجر سے ملاقات ہو لینے دے پھر دیکھ۔

دربان: خلل میرے دماغ میں ہی سہی لیکن حضور بیٹھے رہیے گا یہیں۔ میں ذرا دیر نہیں لگاؤں گا۔ ابھی آیا۔

مہمان: نالائق

پاگل: بھلا آدمی ہے۔

پاگل6 چپ چاپ کھڑا رہ سب کچھ بگاڑ دیگا۔ قابو نہیں ہے؟

پاگل: سر پھرا ہوں۔

پاگل6: تو جا۔

پاگل: چور اندھیرے میں آتا ہے۔ گناہ روشنی میں پہچان لیا جاتا ہے۔ کام کا یہی ایک وقت ہے۔

پاگل: 6 مطلب؟

پاگل: آدمی کا دوسرا نام مطلب ہے۔ وہ اپنے لباس کے لیے ریشم کے کیڑے کو پامال کرتا ہے۔ وہ اپنی غذا کیلئے غریب جانوروں کو حلال کرتا ہے۔ وہ دنیا کی تمام چیزوں کو اپنا خدمت گار خیال کرتا ہے۔ اس لئے تمھیں راحت اور دولت درکار ہے۔

پاگل3: میرے سینے میں آگ کی بھٹی سلگ رہی ہے۔ جس میں میری روح تو میں لکڑیوں کی طرح جل رہی ہیں۔ میری آنتیں لوچ کھا کھا کر اُبل رہی ہیں۔

مہمان: آنتیں لوچ کھا کھا؟ توبہ توبہ۔۔ تب تو فوراً کسی ڈاکٹر کو بلانا پڑے گا۔۔ کوئی ہے؟ کوئی ہے؟ ارے او دربان۔ ان کی آنتیں لوچ کھا کھا کر اُبل رہی ہیں۔ آپ کو علم ہے فون کہاں ہے؟ کسی ڈاکٹر کو نوں کر کے بلا دیجئے۔

پاگل6: ڈاکٹر کو؟ ہم جو یہاں موجود ہیں۔

مہمان: آپ ڈاکٹر ہیں؟ یہ تو خوب ہوا کہ آپ بھی اتفاق سے یہیں ٹھہرے ہیں۔ ورنہ مجھے تو اندیشہ تھا ڈاکٹر کہ آتے آتے یہ صاحب کہیں چلے نا جائیں۔ ذرا دیکھیں مجھے ان کی حالت کافی اندوہ ناک لگ رہی ہے۔

پاگل6: کن کی؟ ان کی؟ لاحول ولا قوۃ۔ ان کو تو میں پل بھر میں ٹھیک کیے دیتا ہوں جادو ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔۔ حسنہ!

پاگل3: کون ہے؟

پاگل6: اچھی حسن!

پاگل3: ارے پر کون؟

پاگل6: عہد و نا۔۔۔۔

پاگل3: وہ چاہ وہ نبھا تیرے دل سے ڈھل گئی
پہلے تھی ایک خواب میں اب آنکھ کھل گئی

پاگل6: بیچے تندرست ہوگئے یہ۔اب چلئے۔

مہمان: یہ کیا بات ہوئی؟

پاگل6: اجی یہ ایک سودائی ایکٹر ہے۔اسے ڈرامے زبانی یاد ہیں۔ان کے فقرے دہراتا رہتا ہے۔اس سے نجات پانے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی ڈرامے کے سین کا آخری حصہ بولیئے جسے بول کر ایکٹر سٹیج پر سے چلا جاتا ہے۔ایسے حصے یہاں سب نے زبانی یاد کر لئے ہیں۔بس وہ بولیئے اور یہ تندرست۔

مہمان: خوب! میں تو پریشان ہوگیا تھا۔سمجھا ان کو کسی مرض کا شدید دورہ پڑ گیا ہے۔

پاگل6: آپ کی تعریف؟

مہمان: میں ایک بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہوں۔

پاگل6: خوب خوب۔میرے پاس اکسیر کا ایک نایاب نسخہ ہے۔آپ استعمال کر سکتے ہیں۔

مہمان: دواؤں کا بیمہ نہیں ہوتا اسکا پیٹینٹ ہوتا ہے۔

پاگل6: پیٹینٹ کے تو جوتے ہوتے ہیں۔

مہمان: وہ پینٹ اور ہے یا اور ہے۔میں پوچھ سکتا ہوں جناب کی تعریف؟ پاگل: ہمیں حکیم ابوالاکسیر کہتے ہیں۔

مہمان: ماشاءاللہ-ماشاءاللہ۔یہیں استراحت فرماتے ہیں آپ؟

پاگل6: جی نہیں یہاں تو محض اتفاق سے آنا ہوا۔یہ لوگ چاہتے تھے کہ ہم اپنی اکسیر سے بعض لوگوں کا علاج کریں۔چنانچہ زبردستی گھسیٹ لائے۔

مہمان: آپ نے کسی کمپنی میں اپنی زندگی کا بیمہ تو نہیں کروایا؟ پاگل6: اب میں کرواؤں گا۔

مہمان: کیوں؟

پاگل6: میں خود ایک بیمہ کمپنی کھولنے والا ہوں بالکل نئی قسم کی۔

مہمان: وہ کیسے؟

پاگل6: اس میں جن لوگوں کی زندگی کا بیمہ کیا جائے گا ان سے قسطیں نہ لی جائیں گی اور انھیں ہر ششماہی کے بعد فیس ادا کر کے میری اکسیر کی تین بوندیں لینی پڑیں گی۔

مہمان: پھر؟

پاگل6: وہ بھی مریں گے نہیں۔

مہمان: آپ تو مذاق کرتے ہیں۔

پاگل6: کچھ عرصے بعد دیکھ لیجیے گا۔یہ سب بیمہ کمپنیاں تھوڑے عرصے کی مہمان ہیں۔میری بیمہ کمپنی کھلی اور یہ سب بند ہوئیں۔اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو ابھی اپنی کمپنی سے استعفی دے کر میرے ساتھ شامل ہو جایئے۔

مہمان: بڑی اچھی بات ہے۔بہر حال خوشی ہوئی۔حسن اتفاق سے آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔

پاگل6: تو میرا خیال ہے آپ بلا تکلف اپنا حال بیان فرما سکتے ہیں مریضوں کا حال پوشیدہ رکھنا میرا خاص اصول ہے۔

مہمان: حال کس قسم کا؟

پاگل6: یعنی کیا شکایات ہیں آپ کو؟

مہمان: مجھے کیا شکایات ہوں گی؟

پاگل6: یعنی آپ چاہتے ہیں کہ ہم پوچھ کر بتائیں۔

مہمان: کیا؟

پاگل6: کہ آپ کن متعدی اور غیر متعدی امراض کا شکار ہیں؟

مہمان ہیں؟ کیا فرماتے ہیں قبلہ میں تو تندرست ہوں۔

پاگل6: تندرست؟ تندرست کون انسان ہوسکتا ہے۔میرے عزیز دنیا میں کوئی انسان تندرست نہیں۔بچہ بھی ماں کے پیٹ سے تندرست پیدا نہیں ہوتا تندرستی جس شے کا نام ہے وہ عنقا ہے۔ورنہ دنیا کو اکسیر کی ضرورت کیوں ہوتی ہے۔

مہمان: ممکن ہے کوئی تندرست نہ ہو لیکن جب تک مجھے کوئی شکایت محسوس نہ ہو تو کیا عرض کر سکتا ہوں

پاگل6: مجھے آپ سے کبھی اتفاق ہے، آپ بے شک عرض نہیں کر سکتے لیکن یہی تو اطباء کا کام ہے کہ مریض کو معلوم تک نہ ہو کہ وہ مریض ہے اور بیان کرتے چلے جائیں کہ اسے کیا کیا امراض ہیں۔

مہمان: یہ باتیں میری سمجھ میں کچھ آ نہیں رہیں۔

پاگل6: آپ کی سمجھ میں تو اپنا مرض بھی نہیں آیا۔لیکن اس سے یہ تو کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کو کوئی مرض ہی نہیں نہیں ثابت ہوتا نا۔میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔

مہمان: ارے جھوٹ تو جب ہو کہ کوئی بات میری سمجھ میں آ رہی ہو۔

پاگل6: نہیں آ رہی نا۔جب ہی تو میں نے کہا تھا کہ آپ کو امراض ہیں لیکن تردد





کی کوئی بات نہیں میں آپ کو اپنی اکسیر دے سکتا ہوں وہی بیمہ کمپنی والی اکسیر کسی سے ذکر نہ کیجئے گا اس بات کا۔

مہمان اللہ جانے آپ کیا انٹ شنٹ فرما رہے ہیں۔

پاگل6: زیادہ سہل الفاظ استعمال میں لائے جائیں؟

مہمان: نہیں میرے خیال میں تو اب آپ جا کر اپنے کمرے میں آرام فرمائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

پاگل6: کس خیال سے۔

مہمان: اس لئے کہ آپ اپنا وقت بھی ضائع کر رہے ہیں اور میرا بھی پاگل6 تو پھر اکسیر ہم آپ کو نہیں دیں گے۔

مہمان: میں نے مانگی کب ہے۔

پاگل6: ہم اپنی بیمہ کمپنی میں تمہیں ایجنٹ بھی نہ بنائیں گے۔

مہمان نہ بنایئے گا۔

پاگل6: اسی وقت یہاں سے باہر ہو جاؤ

مہمان آپ ہمیں یہاں سے نکالنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔یہاں ہر مسافر کو آنے کی آزادی ہے۔

پاگل7: بیشک آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔

مہمان آپ کون

پاگل7: آزادی کا پرستار، اخبار حقوق کا ناچیز ایڈمیٹ ہوں۔

مہمان: آپ کا یہ اخبار اسی شہر سے نکلتا ہے۔

پاگل7: شہر سے نہیں بلکہ بھی پوچھے تو میرے دماغ سے لکھتا ہے۔

مہمان ایڈیٹر صاحب یہ حکیم صاحب کون بزرگ ہیں، عجیب واہی تباہی باتیں کرتے ہیں۔

پاگل7: (ہنستے ہوئے) خیال نہ فرمایئے میرے اخبار میں اشتہار دینے آیا ہے لیکن اگر آپ کو انکی صحبت نہ پسند ہو تو میں انہیں فی الفور یہاں سے رخصت ہونے پر مجبور کر سکتا ہوں۔

مہمان: اگر آپ انہیں چلتا ہی کر دیں تو بہت مناسب ہوگا۔

پاگل7: آداب آداب

مہمان: یہ حکیم ہے کون

پاگل7: ارے یوں تو ایک پاگل شخص ہے ہمارے اخبار میں اشتہار دینے آ جایا کرتا تھا۔

مہمان: پہلے ایک ایکٹر آیا تو اسے حکیم صاحب سودائی کہہ رہے تھے۔اب آپ سے معلوم ہوا کہ خود حکیم صاحب ہی خیر سے دیوانے ہیں۔

پاگل7: آپ کی تعریف

مہمان: میں ایک بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہوں۔

پاگل7: اوہ ہو خوب تو آپ ہمارے اخبار کی ایجنسی لینے کی غرض سے تشریف لائے ہیں۔

مہمان: میں نے عرض کیا میں بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہوں۔

پاگل7: مگر آئندہ اخبار کی ایجنسی لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔مہمان نہیں نہیں اخبار کی ایجنسی کا ذکر میں نے کب کیا۔

پاگل7: اچھا۔۔۔۔تو آپ اخبار میں بیمہ کمپنی کا اشتہار دینے آئے ہیں۔

مہمان: جی نہیں۔میں تو ہوٹل میں محض قیام کیلئے آیا ہوں۔

پاگل7: اور ہو ہو۔اسی ہوٹل میں جس کا اشتہار میرے اخبار میں شائع ہوتا ہے۔

مہمان! ممکن ہے ہوتا ہو۔

پاگل7: تو آپ ہوٹل میں بلا تکلف ٹھہر سکتے ہیں، لیکن ایک درخواست آپ سے ہے کہ مظہر تے وقت ہمارے اخبار کا حوالہ ضرور دیجئے گا۔

مہمان: ضرور ضرور۔میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی زندگی کا بیمہ ہو چکا ہے۔

پاگل7: جی نہیں ہمیں تو نہیں ہوا۔

مہمان: تعجب ہے کہ آپ جیسے تعلیم یافتہ صاحب کو اس ضرورت کا احساس نہیں ہوا۔

پاگل: واقعہ یہ ہے کہ میری زندگی میری اپنی نہیں ہے۔

مہمان: کیا معنی؟

پاگل7: میں اپنی زندگی قوم کی نذر کر چکا ہوں اور قوم کو اتفاق سے اب تک یہ خیال نہیں آیا کہ اسے میری زندگی کا بیمہ کرا ڈالنا چاہیے۔لہذا اگر آپ کو میری زندگی کا بیمہ کرنا ہے تو میرے پاس آنے کی بجائے آپ قوم کی خدمت میں تشریف لے جائیں۔

مہمان: قوم کی خدمت میں کہاں؟

پاگل7: ان تمام بازاروں میں جن کی دکانیں میرے جلوس کے لئے سجا کرتی تھیں میرے آخری جلوس میں قوم نے مجھ پر کچھ خرچ نہیں کیا۔میرا جلوس نکلا اور سوائے میرے چند ساتھیوں کے کسی کو معلوم تک نہ ہونے پایا کہ میرا جلوس نکل رہا ہے۔

مہمان: مدعا یہ کہ آپ اپنی زندگی کا بیمہ دینا چاہتے ہیں مجھے۔

پاگل 7: ہرگز نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں ہاں البتہ ایک چیز ہے میری اسے اگر آپ چاہیں تو اسی وقت بیمہ کر سکتے ہیں۔

مہمان: وہ کیا۔

پاگل 7: میرا اخبار

مہمان: اس قسم کا بیمہ تو ہم نہیں کر سکتے۔

پاگل 7: مجبوری ہے۔

مہمان: ذرا ایک بات بتائیے گا۔

پاگل 7: فرمائیے۔

مہمان: بات کیا ہے کہ اتنے باکمال اس جگہ اترے ہوئے ہیں۔

پاگل: کہاں

مہمان: اس مکان میں

پاگل 7: اس مکان میں۔۔۔۔ خیر اس کے متعلق ہم اپنی رائے آپ کی صحبت میں محفوظ رکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔

مہمان: تابڑ توڑ کئی انوکھی ملاقاتیں کر کے مجھے وحشت ہی ہونے لگی ہے۔ ادھر میجر صاحب بھی نہیں آئے ان کے آنے تک میں ذرا باہر جا کر نہاتا ہوں۔

پاگل 7: باہر آپ کیوں کر جا سکتے ہیں

مہمان: کیوں جا کیوں نہیں سکتا۔

پاگل 7: اور ہو۔

مہمان: بات کیا ہے

پاگل 7: اس لئے کہ حکومت نے آپ کو نظر بند کر رکھا ہے۔

مہمان: مجھے آپ کے دماغ میں کچھ خلل معلوم ہوتا ہے۔

پاگل 3: لیکن کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔

مہمان: یا اللہ یہ کون ہے۔ نہ جانے کس ذخیرہ میں سے یہ اشیاء برآمد ہوئے جا رہی ہیں۔

پاگل 3: اوہ میرا مجنوں۔

مہمان: جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال ہو۔

پاگل 3: اور مجھے یوں نہ دیکھو گویا تم مجھے پہنچانے نہیں۔

مہمان: کیا آپ نے مجھے سے فرمایا بیگم صاحبہ

پاگل 3: بیگم صاحبہ؟ اوہ ہوا تا تکلف لیلی سے اتنا تکلف۔

مہمان: آپ کو نا لیا کسی قسم کا مغالطہ ہو رہا ہے۔

پاگل 3: مغالطہ ستم گر تو تو میری دعاؤں کے جواب میں یہاں بھیجا گیا ہے۔

پاگل 7: نہیں ہم نے گم شدہ زیست کے عنوان سے تمہارا اشتہار اخبار میں چھاپ دیا تھا۔ یہ وہ اشتہار پڑھ کر یہاں آیا ہے۔

مہمان: لاحول ولاقوۃ۔ یہاں قصے کیا ہو رہے ہیں۔

پاگل 3: تیرے۔ اوہ بے وفا تیرے۔ اووعدہ فراموش تیرے۔

مہمان: بیگم صاحبہ آپ کون ہیں میں آپ کو جانتا تک نہیں

پاگل 3: تم نجد کی ان راتوں کو بھول گئے جب تم کھجوروں کے پیڑوں اور صحرا کی لکیروں سے میری باتیں کیا کرتا تھا۔

مہمان: اول تو خدا نہ کرے کہ یہ حرکت مجھ سے سرزد ہوئی ہو اور اگر کسی حماقت کے عالم میں سرزد ہو بھی گئی ہوتی تو میں اسے بھول ہی جانا زیادہ پسند کرتا۔

پاگل 7: اس کا دل تو حکومت سے بھی زیادہ سخت ہے۔

پاگل 3: سنگ دل مجنوں تو میرا دل دکھا رہا ہے۔

پاگل 7: ہم مجنوں کی اس حرکت کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

مہمان: اللہ جانے میں پاگل ہو گیا ہوں یا دنیا پاگل ہو گئی ہے۔

پاگل 3: آجا مجنوں آجا اپنی بیٹی کو اور نہ ترسا۔

مہمان: بیگم صاحبہ فاصلے پر رو کر گفتگو فرمائے۔

پاگل 3: آہ فاصلہ؟ اور جفا شعار کیا صدیوں کا فاصلہ تھوڑا ہے جو تو اب بھی مجھے میں اور اپنے میں فاصلہ رکھنا چاہتا ہے۔

مہمان: ہائے ہائے۔ یہ کیا حرکت ہے میرا ہاتھ چھوڑ ہے۔

پاگل 3: مجنوں او مجنوں میرا دل نہ توڑو۔

مہمان: لاحول ولاقوۃ۔ ارے بھائی میں مجنوں نہیں ہوں نہیں ہوں۔ میرا نام ناصر ہے میں نے جھک مارا جو میں نے اس ہوٹل کا رخ کیا۔ خدارا مجھے چلا جانے دیجئے۔ پھر آئندہ آجاؤں تو مجھے چور کی طرح۔۔۔۔

پاگل 3: اپنی پسلی سے اتنی نفرت؟ لیکن اب میں تجھے ہرگز نہ جانے دوں گی

پاگل 7: ہم لیلیٰ کی اس جرات اور آزادی کو استحصال کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

مہمان: (چلاتے ہوئے) چوکیدار۔ چوکیدار۔ دربان۔ دوڑیئے دوڑیئے آئے آئے۔

پاگل 3: مجنوں اور مجنوں۔

دربان: (تیزی سے آتے ہوئے) صفحے 2 چاہئے یہ کیا ہو رہا ہے۔





مہمان: ارے بھائی اندھا ہے نظر نہیں آرہا کیا ہو رہا ہے؟ اس کالی بلا سے میرا پیچھا چھڑا۔

دربان: چھوڑیئے۔ چھوڑ دیجئے ان کا ہاتھ چھوڑ دیجئے ورنہ میں ابھی پرمیٹنڈنٹ صاحب کو بلا کر لاتا ہوں۔

پاگل 3: مگر یہ میرا مجنوں ہے۔

دربان: مجنوں ہو یا کوئی اور ہو سنبھل کر بات کیجئے اب جا کر سو جائے ورنہ میں گیا سپرمیٹنڈنٹ کو بلانے۔

پاگل 3: اور انہیں نہیں۔ انہیں نہ بلا۔۔۔ اچھا میرے مجنوں صبح تک کیلئے خدا حافظ۔ خدا حافظ۔ الوداع۔

دربان: آپ بھی تشریف لے جائیں نمبر 3

پاگل 7: ہم ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے اس کی تعمیل کریں م

دربان: (مہمان سے) آپ کا کمرہ تیار ہے۔

مہمان: باشو۔ مجھے کمرے کی ضرورت نہیں ہے۔

دربان: ضرورت نہیں ہے؟ یہ کیا بات ہوئی؟

مہمان: میں ابھی یہاں سے نو دو گیارہ ہوتا ہوں۔

دربان: مگر آپ کو کمرے میں ٹھہرنا پڑے گا۔

مہمان: زبردستی؟ دربان: جی بالکل۔

مہمان: معلوم ہے ہم کون ہیں؟

دربان: جی نمبر 5

مہمان نمبر 5: دیکھیئے ہمارا نام ناصر ہے ہم بیمہ کمپنی کے ایجنٹ ہیں۔ بیمہ

دربان: جو کچھ بھی ہو تمھارا نمبر 5 ہے۔ ہمارے یہاں سب بیمار نمبروں سے یاد کئے جاتے ہیں۔

مہمان: بیمار؟ کیا یہ ہوٹل نہیں ہے؟

دربان: ہوئل؟

مہمان اور کیا؟

دربان: یہ پاگلوں کا شفاخانہ ہے۔

مہمان: باپ رے باپ: تو یہ سب لوگ جو مجھ سے ملے پاگل تھے؟ بھئی اب میں بھی یہاں ہے۔۔۔۔۔۔

دربان: جا نہیں سکتے آپ۔ یہیں ٹھہریے۔

مہمان: اب ہم یہاں ٹھہرنے والے نہیں۔۔۔ دربان: جی دروازے پر قفل پڑا ہے۔

مہمان: کھول دروازہ

دربان: جی ہاں۔ کھول ہی تو نہیں رہے۔ مجھے نوکری پیاری نہیں کیا؟

مہمان: نہیں کھولے گا؟

دریان: ہرگز نہیں۔

مہمان: تو لے۔ میں اس کھڑکی کے راستے گیا۔

باکمال، رمز آشنا، عہد ساز شاعر

# عزیز حامد مدنی

ڈاکٹر ابن حسن بدایونی کے مضمون سے اقتباس

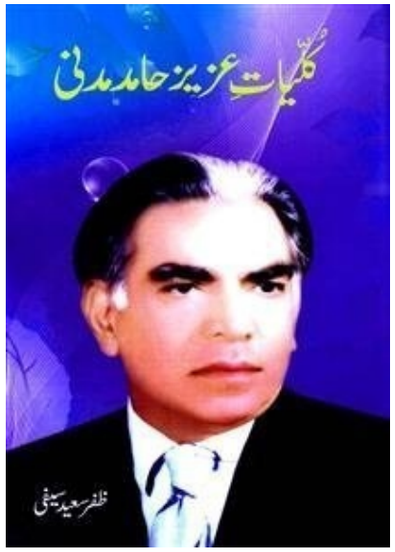




عزیز حامد مدنی 15 جون 1924ء کو رائیپور ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ جہاں تک مدنی کی شاعری کا تعلق ہے انہیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ معمارِ دبستان کراچی، عزیز حامد مدنی منفرد لہجے کے غزل گو شعرا کی صف میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مدنی ہمیشہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ انہیں شعر کہنے کا ہنر آتا تھا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدنی صرف شاعر تھے، انہیں بحیثیت نقاد اور نثر نگار بھی بہت پذیرائی نصیب ہوئی۔

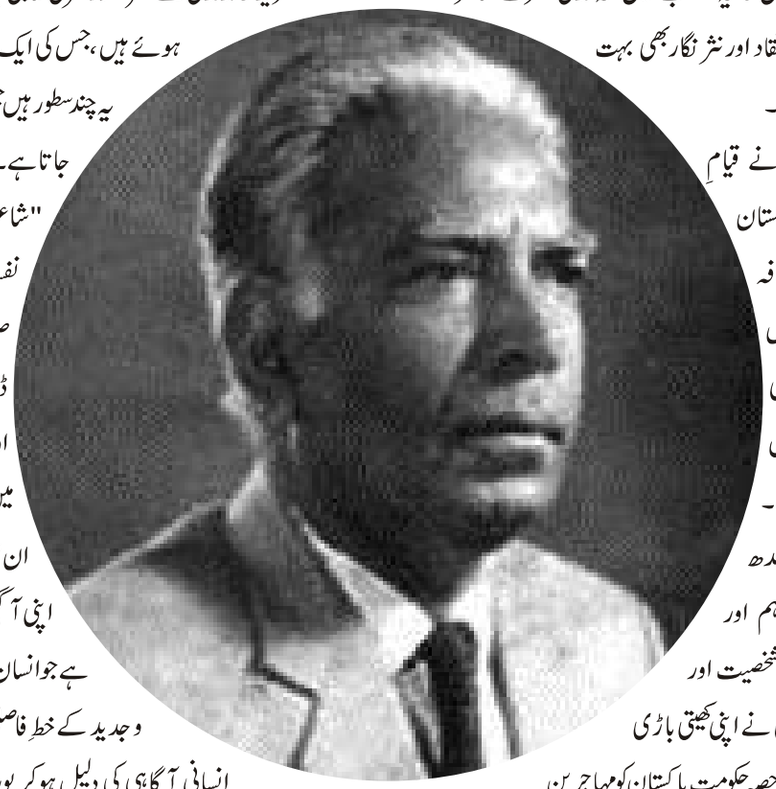



عزیز حامد مدنی نے قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کے پہلے دارالخلافہ کراچی میں مہاجروں کی پہلی بستی پیر الٰہی بخش کالونی میں سکونت اختیار کی۔

1948ء میں صوبہ سندھ کے ایک انتہائی اہم اور معروف علمی و ادبی شخصیت اور زمیندار پیر الٰہی بخش نے اپنی کھیتی باڑی کی زمین کا ایک بڑا حصہ حکومتِ پاکستان کو مہاجرین کی آبادی کے لیے بغیر کسی معاوضے کے پیش کر دیا جس میں 1990ء گز پر مشتمل رہائشی مکانات تعمیر کیے گئے۔ میجر حسن نے اس قطعۂ آراضی کو پیر الٰہی بخش کے نام سے منسوب کر دیا۔ پاکستان کے تقریباً تمام اہل علم و دانش پیر الٰہی بخش کالونی کراچی میں قیام پذیر تھے۔ جن میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، شاہد احمد دہلوی، مشتاق احمد یوسفی، پروفیسر محمد حسن عسکری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ابراہیم جلیس نصر اللہ خان، فاطمہ ثریہ بجیا، امید فاضلی صاحبہ لکھنوی ڈاکٹر عشرت حسین، جسٹس ریٹائرڈ سید مظہر علی، ڈاکٹر غلام سرور اور راقم الحروف کے علاوہ بے شمار دوسرے اہلِ قلم شامل تھے۔

عزیز حامد مدنی کے شعرا اور نصری تقابلی جائزے اپنے اندر ایک جہانِ تازہ آباد کیے ہوئے ہیں، جس کی ایک مثال مدنی کی اپنی کتاب کے حصہ اول کی یہ چند سطور ہیں جنہیں قارئینِ ادب کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

"شاعری تہذیب کی زبان ہوتی ہے۔ وہ انسانی نفسیات کی فتح و شکست کے درمیان پوری صنف داستان، افسانہ، ناول، تنقید اور ڈرامہ اور کسی قدر وسیع معنی میں جمالیات اور تاریخ کی تحریریں، اپنے تخلیق کی عناصر میں ناقابلِ فراموش انسانی دستاویز ہیں اور ان تمام شعبوں کی حدوں سے آگے شاعری اپنی آگہی میں ان ساری رکاوٹوں کو عبور کر جاتی ہے جو انسان کی فطری آزادی میں حائل ہیں۔ وہ قدیم و جدید کے خطِ فاصل کو توڑ کر انہیں ہم رشتہ کر دیتی ہے۔ وہ انسانی آگاہی کی دلیل ہو کر پورے نظامِ کائنات میں اس کی تلاش، اس کے خواب، اس کی شکستِ خواب، اس کی پکار کا اضطراب اور اس کی پسپائی کی راہ بن جاتی ہے۔ اس کے تخلیقی عناصر میں انسان کی ہر صحیح و فکر کا گوشہ جا کر مل جاتا ہے، ایجاد اور دریافت سے پیدا ہونے والے تاثرات داخل ہو جاتے ہیں اس کے جذب





دروں ان کے شفاعت کی ایسی دنیا ہوتی ہے جس کی ایک سے زیادہ تفسیریں ہو سکتی ہیں۔ ہم ایسی کیفیتوں سے ہو کر وسنوکلیز، رومی و حافظ، شیکسپیئر و گوئیٹے، میر و غالب کے کلام سے گزرتے ہیں۔ شعرا کا یہ معیار ہمیشہ توجہ کا مستحق رہے گا۔"

عزیز حامد مدنی کا علم انتہائی وسیع تھا۔ مشرق و مغرب کے ادب سے وہ مکمل طور پر آشنا تھے۔ عزیز حامد مدنی مست اور بے پرواہ آدمی تھے۔ ہمہ وقت بے خودی اور سرشاری میں ڈوبے رہتے تھے۔ راقم الحروف نے کراچی کے دبستان شاعری میں اردو غزل کا ارتقا کے موضوع پر اپنے تحقیقی مقالے میں مدنی کے بارے میں تحریر کردہ گوشے میں ان کی شخصیت پر یوں اظہارِ خیال کیا ہے۔



عزیز حامد مدنی قناعت پسند، سادہ مزاج، دوستوں کے دوست اور شعری رویوں میں منفرد انداز کے حامل نظر آتے ہیں۔ وہ کراچی کے شہری دبستان ہی کے نہیں، اپنے عہد اور بر صغیر کے علم و ادب کے بہترین انسان تھے۔ مدنی نے عہد حاضر کی پیچیدگی سفا کی اور ثقافت کو پوری طرح محسوس کیا ان کی شاعری میں اس عالمی رویے کے بارے میں بلیغ اور پرکار اشارے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری بیسویں صدی کے ایک نابغۂ روزگار شاعر کے ذہنی اور روحانی قرب کا اظہار ہے۔ اس کے یہاں ماضی کی روایتِ حال کے حقائق اور مستقبل کی بشارت نظر آتی ہے۔ ان کی اردو غزل کی شعری علامتوں میں نیا پن اور نئی معنویت ملتی ہے۔ ان کا کلام بڑا توانا، بڑا سجا ہوا اور ایک ناکام محبت کا ماتم دار ہے۔ ان کی بعض غزلیں بیسویں صدی کے شعری مرقع کی کامیاب ترین تصویر ہیں۔ حامد مدنی کو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ اُنھوں نے نسل میں اردو کی جدید شاعری کا جو تذکرہ قلم بند کیا ہے وہ ایک یادگار علمی اور ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک بڑے اور دردمند فنکار کا مرتب کردہ ہے۔"

عزیز حامد مدنی غزل کے ساتھ ساتھ نظم بھی منفرد انداز سے تحریر کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ کراچی کے سائلِ سمندر پر واقع شہر نے مدنی کو ایک نئی سوچ سے ہمکنار کیا۔ جون 1979ء میں انہوں نے ایک نظم، سفینہ، تحریر کی جس نے ان کی فکر کے نئے در وا کیے۔ یہ نظم قارئین آہنگ کے لیے پیش خدمت ہے۔

سوادِ شہر کو، ساحل کی روشنی کو سلام
کبھی یہ فن کا سفینہ رہا شکستہ و بے نام
اٹھا سکا نہ شبِ غم میں کبھی کسی عنواں ستونِ روشنی شہر، یار کے احساں
ہوا نے، ابر نے، موجوں نے اِس کو گھیر لیا
کئی غنیموں کی فوجوں نے اس کو گھیر لیا
ہوائے بحر نے غصے میں جال ڈال دیا
نحیف جان کے ترشول پر اچھال دیا
اِدھر پہاڑ سی موجیں تھی اور ہوا کا جنوں اِدھر تھا زور پہ کچھ اس ناتواں۔۔۔۔۔ کا جنون
دعائے رد بلا دو کہ آسرا رکھے
حصار خوں گہی میں اِسے خدا رکھے
جہاز رانی کے خط ہائے راہ داں رہ جائیں
اندھیری شب میں ستارہ و بادباں رہ جائیں

# عرش صدیقی

عرش صدیقی 21 جنوری 1927 کو داس پُر جنوبی پنجاب میں پیدا ہوئے۔آپ شاعر ہونے کے علاوہ بہترین نقاد اور شارٹ سٹوری لکھنے میں کمال رکھتے تھے۔عرش صدیقی نے لاہور کالج سے ایم اے انگلش کیا ایپروز ونا یونیورسٹی امریکہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔آپ گورنمنٹ کالج ملتان سے بطور پروفیسر درس وتدریس سے منسلک ہوتے بعد اذاں بہاؤدین ذکریا یونیورسٹی میں بطور چیئرمین انگلش ڈیپارٹمنٹ فائز رہے۔18 اپریل 1997 میں رضائے الٰہی سے وفات پا گئے اور علم وادب کا ایک گراں قدر رباب ختم ہوا۔

ہاں سمندر میں اتر لیکن اُبھرنے کی بھی سوچ
ڈوبنے سے پہلے گہرائی کا اندازہ لگا
اِک تیری بے رخی سے زمانہ خفا ہوا
اے سنگِ دل تجھے بھی خبر ہے کیا کیا ہوا
ہم بھی مایوس نہیں ہیں اُنہیں پا ہی لیں گے
لوگ کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے خدا ملتا ہے
وہ عیادت کو تو آیا تھا مگر جاتے ہوئے
اپنی تصویریں بھی کمرے سے اتار کر لے گیا
دیکھ رہ جائے نہ تو خواہش کے گنبد میں عاصر
گھر بناتا ہے تو سب سے پہلے دروازہ لگا

# یکم اپریل ایک تاریخ ساز دن

تحریر: الطاف احمد خان

آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور کے اجتماع میں قرارداد منظور ہو چکی تھی جس کی رو سے مسلمانان ہند نے اپنے لیے آزادی اور علیحدہ ریاستوں کا مطالبہ کیا تھا۔اس دوران یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ جن علاقوں پر پاکستان نے قائم ہوتا ہے، وہاں کی کوئی اسمبلی بھی تو اس مطالبے کی تائید کرے اس مرحلے پر سندھ اسمبلی نے وہ تاریخی قرارداد منظور کی جو آل انڈیا مسلم لیگ کے موقف کو طاقت ور کر گئی۔اس قرارداد میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے اس مطالبے کی کھل کر تائید کی گئی تھی جو قرارداد لاہور کے تناظر میں آل انڈیا مسلم لیگ کر رہی تھی۔اگر سندھ صوبہ نہ بنا ہوتا اور میٹی کا حصہ ہوتا تو کیا مٹی کونسل کی ایسی قرارداد کا منظور ہونا ممکن تھا؟ شاید نہیں، یقیناً نہیں کہ ممبئی کی ہندو اکثریت تو سندھ کے علیحدہ صوبے کا درجہ حاصل کرنے کی شدید مخالف تھی۔

قائد اعظم کی دور رس نگاہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ پاکستان حقیقت کا روپ دھارے گا تو اس کے لیے کراچی اور سندھ ضروری ہوں گے، اسی لیے انھوں نے اپنے ۱۴ نکات پر نہیں، ہر پلیٹ فارم پر سندھ کے مسلمانوں کی اجتماعی جدوجہد کی نہ صرف تائید کی بلکہ کھل کر حمایت کی، ورنہ تو سندھ کے متمول ہندو سیٹھ جو بھائی بند" کہلاتے تھے اور حکومتی سطح پر انتظامی امور میں شریک "عامل سبھی اینٹی کرپشن کمیٹی کو سپورٹ کر رہے تھے جس نے اپنی شاخ لندن میں قائم کی تھی کہ سندھ صوبے کا درجہ حاصل نہ کر سکے، کیوں؟ محض اس لیے کہ سندھ کا مسلمان علیحدہ صوبہ بننے کے بعد ان کے سیاسی اور معاشی شکنجے سے نکل جائے گا اور ہوا بھی یہی کہ 1932ء میں سندھ کو صوبے کا درجہ ملا تو سندھ کے ہندوؤں کا اقتصادی کنٹرول خاصا کم ہوا اور آنے والے دنوں میں مسلمانوں کو سیاسی طور پر حق حاکمیت بھی ملا۔یکم اپریل ہر سال بڑی خاموشی سے گزر جاتا ہے، حالانکہ یادوں کی کتاب کے اوراق پلٹیں تو یہ دن سندھ کی سیاسی تاریخ میں کئی اعتبار۔

اور منفرد نظر آتا ہے کہ اس روز سندھ کو علیحدہ صوبے کا درجہ ملا تھا اور اس وقت کی ہندو آبادی نے اس کی شدید مخالفت کی تھی لیکن اب سب کچھ ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ سندھ کے قوم پرست ہوں یا وفاق پرست حتی کہ حکومت اور اپوزیشن میں بیٹھی قیادت بھی کسی کو کچھ یاد نہیں۔ ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آنے والے انگریزوں نے جب 1839ء میں کراچی اور 17 فروری 1843ء کو سندھ پر قبضہ یا غلبہ حاصل کیا تو کم وبیش چار سال بعد اسے کمشنری کا درجہ دے کر بمبئی پریزیڈنسی سے منسلک کر دیا۔ دلچسپ امر یہ تھا کہ سندھ کا انتظام سنبھالنے والے انگریز کمشنر کے اختیارات اس کے دیگر ہم منصبوں سے کہیں کم تھے۔سندھ کے باشندوں کا رہن سہن، زبان و طعام اور معاملات اہل بمبئی سے یکسر مختلف تھے۔اس کی مماثلت پنجاب اور بلوچستان سے تو تھی لیکن آٹھ سو میل دور بمبئی سے کوئی تعلق نہ تھا۔خود بمبئی کے گورنر اور سرکاری عمل داروں کے نزدیک سندھ کی ترجیح کا حصہ نہ تھا۔ بقول سائیں تھی۔ایم۔سید پورے سال میں گورنر بھی تین ہفتے کے لیے، ہمبر فنانس دو دن کے لیے، ممبر ریونیو دو دن کے لیے، بلدیات کا وزیر چار دن اور تعلیم کا وزیر ایک ہفتے کے لیے سندھ آتا اور ان کا بھی بیش تر وقت کراچی ہی میں گزرتا۔بمبئی صوبے میں ہندو اکثریت میں تھے، سندھ کی مسلم اکثریت کی کچھ نہ چلتی۔مجموعی طور پر 120 اور 80 فی صد کا تناسب تھا۔ابتدا، سندھ کے ہندو سیاست داں ہر چندرائے، دشن دس نے سندھ کی بیٹی سے علیحدگی کی آواز اٹھائی۔ یہ ہم 20 ویں صدی کے پہلے عشرے میں شروع ہوئی، 1930ء سے 1936ء تک زور پکڑا اور پھر مثبت نتائج لے کر کامیاب ہوئی۔اس تحریک کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ جب سندھ بھر کے مسلمان اس مطالبے کی حمایت میں سڑکوں پر نکلے تو ہندو آبادی نے اسے اپنے لیے خطرہ جانا اور اس کی ڈٹ کر مخالفت کی حتی کہ اینٹی سپریشن کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس کے تحت کراچی، حیدر آباد اور سکھر میں بڑے بڑے اجتماعات بھی ہوئے۔یوں یہ تحریک ہندو مسلم تضادات کو ابھار گئی۔

سندھ میں دو قومی نظریے کا تصور گزشتہ صدی کے ابتدائی تین عشروں ہی میں رائج ہو

گیا تھا، کیونکہ مسلمان سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے حامی اور ہندو اس کے شدید مخالف تھے، اور یہ مطالبہ ہندو مسلم تقسیم کا سبب بھی بنا۔ مسلم شخصیات میں غلام محمد بھر گڑی نے اسے مختلف فورمز پر اٹھایا۔ 1917ء میں سندھ نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن نے ایڈون مائیگو کو کراچی ملاقات میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ پیش کیا۔ شیخ عبدالمجید سندھی نے 1924ء میں جب وہ مسلمانانِ سندھ کے ترجمان الوحید کے ایڈیٹر تھے، اخبار میں اس مطالبے کے حق میں بھرپور مہم چلائی، 1925ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے علی گڑھ اجلاس مین متفقہ قرارداد منظور ہوئی۔ 1929ء کی آل پارٹیز لکھنؤ میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے مطالبے کی تائید کی گئی۔ اس اجلاس میں مہاراجا محمود آباد علی امام، چوہدری خلیق الزماں اور ایم۔سی۔ چھاگلہ شریک تھے۔ کلکتہ کے آل پارٹیز کنونشن نے بھی اسے درست جانا اور حمایت کی۔ اس طرح دہلی میں منعقدہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۲۹ء کے اجلاس میں بھی جس کی صدارت سر آغا خان نے کی تھی، اس مطالبے کی تائید کی گئی۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے کان پور اور اجمیر کے اجتماعات میں بھی مسلم قائدین نے مسلمانِ سندھ کے مطالبے کی تائید کی اور کل ہند گول میز کانفرنس میں بھی یہ مسئلہ مسلم لیڈروں کی حمایت کے ساتھ پیش ہوا۔ ایک طرف سندھ کے مسلمان اپنے طور پر اس مسئلے پر مذاکرات، اجتماعات اور دیگر ذرائع سے اپنا موقف پیش کر رہے تھے تو دوسری طرف شیخ عبدالمجید سندھی، سر عبداللہ ہارون اور خان بہادر ایوب کھوڑو اسے آل انڈیا لیول پر مضبوط کیس کی صورت میں پیش کر رہے تھے، کیونکہ سندھ میں کانگریس کمیٹی ہندو مہاراجا سجا اور دیگر تنظیمیں مقامی طور پر اور کل ہند سطح پر اپنے اثرات استعمال کر کے مسلم جدوجہد کا تاثر زائل کر رہی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سندھ مالی طور پر کمزور صوبہ ثابت ہوگا اس لیے اس کی علیحدگی کا جواز نہیں ہے۔ ایوب کھوڑو نے 1930ء میں ایک کتاب سفرنگ آف سندھ لکھی۔ شیخ عبدالمجید سندھی نے ''الوحید کے مضامین کتابی صورت میں شائع کیے، پارسی شخصیت جمشید مہتا نے پمفلٹ طبع کرایا حتی کہ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے مشہورِ زمانہ ۱۴ ارنکات پیش کیے تو ان میں بھی ایک نکتہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا تھا۔ اس موثر مہم ہی کا نتیجہ تھا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی، سندھ کانگریس کمیٹی اور دیگر ہندو لیڈر اس مطالبے کو تسلیم کرنے گے، کچھ نے مشروط حمایت کی اور دیگر نے بعض تحفظات کے ساتھ، یہاں تک ہوا کہ لندن میں ہندوؤں نے ایک دفتر قائم کر کے وہاں مقتدر حلقوں تک مخالفانہ موقف پہنچایا جس کے جواب میں سندھ کے مسلمانوں نے سندھ آزاد کمیٹی تشکیل دی اور لندن میں اس کی شاخ قائم ہوئی تا کہ ہندو پروپیگنڈے کا اثر زائل کیا جا سکے۔ حاجی عبداللہ ہارون نے ء میں مسلمانوں کا ہفتہ منانے کی تجویز دی۔ بعد میں کئی برس بعد 61 دسمبر 1932ء کو سندھ آزاد کانفرنس کی اپیل پر سندھ کے مسلمانوں نے یوم آزادی سندھ منایا اور صوبے بھر میں منعقدہ اجتماعات کے شرکا نے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ کیا۔ بعدازاں برطانوی وزیراعظم اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے سامنے ہندوستان کی نئی آئینی اصلاحات کا بل پیش ہوا جس کی ایک شق کے تحت سندھ کو علیحدہ صوبے کا درجہ ملنا تھا۔ بل کی منظوری کے بعد 22 جنوری 1936ء کو ایک حکم کے ذریعے یکم اپریل 1936ء سے سندھ کو صوبے کی حیثیت دے کر بمبئی کے چنگل سے آزاد کر دیا گیا۔ مسلمانانِ ہند کی جدوجہد کامیاب ہوئی اور اس صوبے کی اسمبلی ہی نے سب سے پہلے مطالبہ پاکستان کی حمایت میں تاریخی قرارداد منظور کی۔ پاکستان کے حصول کی جدوجہد موجودہ پاکستان ہی نہیں، مشرقی بنگال اور مسلم اقلیتی صوبوں اور متحدہ ہند کے ان تمام علاقوں میں کی گئی جہاں کے باشندوں کو پتا تھا کہ علیحدہ ریاست میں جغرافیائی طور پر ان کا علاقہ شامل نہ ہوگا لیکن ان کا ملی جذبہ حکم تھا۔ وہ ایک آزاد مملکت کا حصول چاہتے تھے اور بالآخر ان کی جدوجہد کامیاب ہوئی۔ سندھ اس جدوجہد میں سب کے شانہ بشانہ تھا شیخ عبدالمجید سندھی، غلام حسین ہدایت اللہ، پیر الٰہی بخش، ایوب کھوڑو اور سی محمد اکبر شاہ ہی نہیں، مولانا ظہور الحسن درس سمیت درجنوں اہم شخصیات نے تن من دھن سے قائداعظم محمد علی جناح کا ساتھ دیا تا کہ علامہ اقبال کے تصویر پاکستان کو عملی شکل مل سکے۔ بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جنت ارضی پاکستان حاصل ہوا اور قرارداد لاہور کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس ساری جدوجہد میں یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جب سندھ کو بمبئی سے آزادی مل گئی تھی۔ اگر قائداعظم کے ۱۴ ارنکات میں یہ مطالبہ شامل نہ ہوتا اور سندھ صوبہ نہ بنتا تو وہ قرارداد جو پاکستان کے مطالبے کی مضبوط آواز بنی کس صوبے سے منظور ہوتی؟

آیئے یکم اپریل کے تاریخی موقع پر ان اکابرین کی جدوجہد کو خراج عقیدت پیش کریں جنھوں نے لاہور کے اجتماع میں مطالبہ آزادی کیا اور ان ارکانِ اسمبلی کو اپنا محسن تسلیم کریں جو اس مطالبے کی حمایت میں قرارداد منظور کر کے آل انڈیا مسلم لیگ کے دست و بازو بنے اور اس مطالبے کو عملی صورت دے گئے جو چاروں موسموں، سمندروں، دریاؤں، معدنی وسائل اور دیگر نعمتوں سے مالا مال ہے اور جسے دنیا پاکستان کے نام سے پہنچاتی ہے۔

شکریہ آہنگ

2017

فکری ملکیت کا ادارہ (intellcetiual proprty orgnaization) اقوام متحدہ کے چند خصوصی اداروں میں سے ایک ہے جو اقوام متحدہ کے زیر نگرانی لوگوں کے فلاح و بہبود کے لئے کام کرتے ہیں۔ اس ادارے کا صدر جنیوا (Swizarland) میں واقعہ ہے۔ 26 اپریل کو ہر سال باقاعدہ طور پر یہ عالمی دن منایا جاتا ہے۔ فکری ملکیت سے مراد فکری تخلیق کے دعوے دار کو یہ قانونی حق حاصل ہوتا ہے کہ جو اس کی تخلیق ہے۔ وہ کسی اور نام کے ساتھ منسوب نہ ہونے پائے۔ فکری ملکیت کے تحفظاتی انتظامات ہیں جن میں شامل (trade mark) وہ نام جو قانونی طور پر کسی شخص یا ادارے کے ساتھ منسوب ہو جائے copy right نقل واشاعت کے حقوق patent حسن تحفظ کی سند کچھ خاص دورانیے کے لئے اور صنعت ڈیزائن کے حقوق، یعنی ایسے ڈیزائن جو دستکاروں سے تعلق رکھتے ہوں اور کچھ خاص دائرہ کار میں رہتے تجارتی راز (trade secrets) علاوہ ازیں فنکارانہ نام بشمول موسیقی اور ادب کے ساتھ ساتھ نئی دریافت ایجاد الفاظ، جملے، علامات وغیرہ فکری ملکیت کی چھتری کا حصہ ہیں۔

فکری ملکیت کا معاملہ اس وقت درپیش ہوا جب 1873 میں وپانا (آسٹریا) میں بین الاقوامی سطح پر ایک میلہ منعقد کیا گیا جس کا بنیادی مقصد ان لوگوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانا تھا جو تخلیاتی زندگی کا حصہ رہتے اور اپنی مختلف ایجادات کو دنیا کے سامنے لانے چاہتے تھے مگر اس ڈر سے حصہ لینے سے پیچھے ہٹ گئے کہ ان کی ایجادات دوسرے ممالک میں کوئی اور اپنے نام سے شروع نہ کر دے۔ لہذا اس مسئلے کے ادراک کے لئے ایک ادارے کے قیام کے عمل میں لانے کے لئے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا گیا جو فکری ملکیت کا نہ صرف تحفظ بلکہ اس بات کو بھی یقینی بنائیں کہ کوئی اس کی کسی کی تخلیق کو اپنا کہہ کر نہ بیچ سکے۔ یہ سہر بہت کوشش کے بعد مقام مجلس برائے کسی ملکیت کے ادارے (commition establishing and intellectual property organization) کو جاتا ہے۔ 1970 میں ادارے کو باقاعدہ نافذ العمل کرایا گیا اور اس ادارے کے کل ارکان کی تعداد 189 ہے۔ پاکستان میں فکری ملکی تکے ادارے کا قیام 13 اپریل 2005 میں عمل میں آیا البتہ اس کا باقاعدہ اطلاق ایک قانونی عمل داری کے تحت 2012 میں پارلیمنٹ میں منظور کیا گیا۔ 25 جولائی 2012 کو اس ادارے کے انتظامی اختیارات کا بینہ

سے کامرس کو منتقل کر دئے گئے جس کے بنیادی امور درج ذیل ہیں۔

☆فکری ملکیت کے تحفظ کو اور مضبوط بنانے کے لئے تمام حکومت کا نظام کو مربوط کرنا

۔

☆ ملک میں تمام فکری ملکیت کے دفاتر کے انتظامی امور دیکھنا۔

☆فکری ملکیت کے حقوق کے بارے میں آگاہی کرنا۔

☆فکری ملکیت پر حکمت عملی کو وضع کرنے کے لئے وفاقی حکومت کا ساتھ مشاورت کرنا۔

☆فکری ملکیت کے حقوق نافذ کرنے والے اداروں (پریس ، ایف آئی ایاور پاکستان کسٹمز) کے ذریعے مؤثر نفاذ کو یقینی بنانا۔

☆فکری ملکیت سے حقوق کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لئے کچھ چیزوں کو جاننا اخذ ضروری ہے۔جس میں پیٹنٹ ہے۔اس سے مالک کے حق کا تحفظ جا سکتا ہے جو گورنمنٹ موجد کر دیتی ہے جس کی بدولت مالک یا موجد کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ جسے چاہے اس کے بنانے کا استعمال کرے، بیچنے کا حق اور جسے چاہے اسے اس حق سے محروم کر رکھے۔یہ سند ایک خاص معینہ مدت تک گورنمنٹ کی طرف سے دی جاتی ہے کاپی رائیٹر اس سے مراد نقل اشاعت کے حقوق ہیں یہ حقوق بھی کچھ خاص مدت کے لئے کارآمد ہوتے ہیں۔نقل اشاعت کے حقوق کا اطلاق، تخلیقی، دانشوارانہ یا فنکارانہ اشکال کے کاموں پر ہوتا ہے۔البتہ خیالات ومعلومات کاپی رائیٹر کے حقوق سے میسر ہیں۔بشرطیکہ جس طرح وہ اظہار کئے گئے ہوں اس کے علاوہ

انڈسٹریل ڈیزائن رائیٹس یا صنعتی ڈیزائن سے مراد ایسے حقوق ہیں جن کا تعلق مفاد عامہ یا کسی سہولت سے نہ ہو، مثلاً ایسے ڈیزائن جو درست کاری سے تعلق رکھتے ہوں یا ان میں کوئی خاص نمونے یا رنگوں کی تشکیل وتربیت پائیں۔شکل میں نمونے اور جمالیاتی انداز میں رنگوں کے امتزاج کا استعمال ہو۔علاوہ ازیں صنعتی ڈیزائن دو یا تین جہتی نمونوں کے ذریعے مصنوعات کی پیداوار بھی ان تمام حقوق کے تحفظ کے حصہ ہے۔

پلانٹ ورائٹی یا مختلف اقسام کے پودوں کے حقوق کا مقصد تجارتی طور پر ایک نئی قسم ہے پودے کو اگانے کے حقوق کا تحفظ ہے جس میں مختلف اقسام کے پودوں کے درمیان ایک نئی جدت اور فرق کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا اندراج کرنے اور مواد کی تشہیر کی جانچ پڑتال کرنا شامل ہے۔

ٹریڈ مارک سے مراد وہ نام ہے جو قانونی طور پر کسی شخص یا ادارے کے ساتھ منسوب کیا جائے۔ٹریڈ مارک کا ڈیزائن یا علامت یا اظہار کا طریقہ کار ایک ادارے کی پروڈکٹ یا سروس کو دوسرے ادارے کی پروڈکٹ یا سروس سے ممتاز کرتا ہے۔

ان سب معاملات میں رسمی طور پر گورنمنٹ تحفظ فراہم نہیں کرتی ، بلکہ کاروبار کے مالکان کو اپنے تجارتی راز چھپانا اور اس کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے بھی خود ہی معاملات طے کرنا ہوتے ہیں۔مثلاً پیپسی کولا یا کوکا کولا یا کوئی بھی مشہور کھانے کے برانڈ کا فارمولا وغیرہ۔

بین الاقوامی فکری ملکیت (WPO) ایک بڑی حد تک مالی معاملات میں خود کفیل ہے۔ادارہ اپنے کل بجٹ کا 90 فیصد حصہ وسیع پیمانے پر ہونے والے بین الاقوامی سطح پر اندراج، اشاعت اور ثالثی خدمات کے عوض پورا کرنا ہے اور بقیہ اقوام ادارے کو رکن ممالک سے چندے کی صورت پہنچتی ہے۔

# ملیریا کا عالمی دن

## مچھروں کا خاتمہ تحفظ کی ضمانت

بظاہر بے ضرر نظر آنے والد نھا منا مچھر انسان کا ہر دور میں دشمن رہا ہے۔مچھر نے یہ دشمنی ہمیشہ نبھائی ہے، جب اس کا وار ہوا، اس نے لاتعداد انسانوں کو ہلاک کیا یہ اس اعتبار سے بھی خطرناک ہے کہ اس نے ہر بار انسانی کوششوں کو ناکام بنایا اور اپنے لئے مدافعتی صلاحیت حاصل کر کے خود کو انسان کو سب سے زیادہ سخت حریف ثابت کیا ہے۔

ملیریا وہ عارضہ ہے جو ایک اچھے بھلے انسان کو نڈھال کر دیتا ہے اور اس کی شدت موت کا سبب بن جاتی ہے ۔ مچھروں کے خاتمے سے متعلق معلومات رکھنے والے بہت سے ممالک میں ملیریا کے باعث ادویات عام سی بات ہے اور ترقی اور ترقی یافتہ ممالک بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں۔حیران کن بات یہ ہے کہ ملیریا ایک خاص قسم کے مچھر انوفیلز سے پھیلتا ہے ، وہ بھی مادہ انوفلیز سے انوفیلز میلریا پھیلانے کا ذریعہ نہیں بنتا ہے ۔اب تک کی معلومات دستیاب معلومات کے مطابق مچھروں کی اقسام میں انوفیلز مچھروں کی چار سو سے زیادہ اقسام ہیں، جن میں سے 70 طرح کی مادہ انوفیلز ملیریا پھیلاتی ہیں۔جن میں سے تیس اقسام زیادہ خطرناک ہیں۔دنیا کے مختلف حصوں میں انوفیلز کی مختلف اقسام کے ذریعے ملیریا پھیلتا ہے۔

ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ مچھر کی تمام اقسام خون چوسنے والی نہیں ہوتیں۔مثلاً انوفیلز کی خوراک پودوں اور درختوں کا رس ہوتی ہے۔انسانی خون سے حاصل کرتی ہے ۔قدرتی طور پر مادہ انوفیلز کے منہ کی ساخت ، خون بھی خون میں شامل ہو جاتا ہے جو خون کو جمنے نہیں دیتا۔جب مادہ انوفیلز کی ملیریا زدہ کا خون چوسنے کے بعد کسی صحت مند فرد کا خون چوستی ہے تو اس عمل کے دوران وہ ملیریا کے جراثیم میں اس میں منتقل کر دیتی ہے ۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور یوں مچھروں کی افزائش کے موسم اور ماحول میں ملیریا ایک فرد سے دوسرے فرد کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔مچھروں کی بہتات خصوصاً انوفیلز مچھروں کی موجودگی میلریا کے امکانات بڑھاتی ہے ۔ ملیریا وبائی صورت ایسے ہی علاقوں میں اختیار کرتا ہے ۔فضا میں اڑتے ہوئے مچھروں کو مارنا آسان نہیں ہے لیکن مچھروں کے اڑنے کا مرحلہ بعد میں آتا ہے جبکہ انہیں خطرہ بننے سے پہلے ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ضروری ہے کہ مچھروں کے مدارجِ زندگی کو سمجھ لیا جائے۔

مچھر کی زندگی کے چار مراحل ہیں جن پر غور کرنا بے حد ضروری ہے۔انڈہ، لاروا، پیوپا اور بالغ مچھر۔مچھر کے انڈے لگ بھگ دس روز پانی میں رہتے ہیں اور لاروے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ۔لاروا بھی پانی میں رہتا ہے ۔اس دوران اسے غذا کی ضرورت نہیں پڑتی البتہ آکسیجن کے لئے یہ سطح آب پر آتے رہتے ہیں۔لاروے سے پیوپا بننے کے چار دن بعد یہ مچھر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جلد ہی اڑنے لگتا ہے۔مچھر کی زندگی چند

گھنٹوں سے چند ماہ تک ہوتی ہے۔ایک بالغ مچھر اپنے سکن سے اوسطاً دوکلومیٹر تک اڑتا ہے۔ بالغ مچھر رکے ہوئے پانی، کاٹھ کباڑ، نیم تاریک مقامات پر آسانی سے رہتے ہیں۔ یہ عموماً دور دور تک بکھر جاتے ہیں۔ لہذا مچھروں سے نجات کا بہترین مرحلہ وہ ہے جب وہ پانی میں زندگی کے ابتدائی مراحل طے کررہے ہوں۔ یہ آسان بھی ہے اور باکفایت بھی۔اس سے بہت بہتر یہ ہے کہ آبادیوں کے درمیان اوراطراف میں اپنی جمع نہ ہونے دیا جائے۔اگر گڑھوں یا نشیبی علاقوں میں پانی جمع ہوتو اس پرمٹی کا تیل یا کوئی مناسب کیمائی مادہ چھڑک دیا جائے۔

ملیریا سے بچاؤ کا دوسرا طریقہ کوؤں کو مچھروں سے محفوظ بناتا ہے۔اس کے بہت سے طریقے ہیں۔مثلاً گودوں کے اطراف میں صفائی کا اہتمام کیا جائے، پانی کے نکاسی کا نظام معیاری ہوتا کہ پانی کسی جگہ نہ ٹھہرے اور مچھر پروان نہ چڑھ پائیں۔

گھڑوں کو بھر دیا جائے بے کار گھاس پھونس اور جھاڑیاں باقی نہ رہنے دیں۔

زرعی اور نہری علاقوں میں مچھروں کو خوب افزائش ہوتی ہے۔لہذا ان علاقوں میں مچھروں پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔جوہڑوں اورتالابوں والے علاقوں میں ایسی مچھلیاں پالی جاسکتی ہیں جو مچھروں کے لاروے کھاتی ہیں اور اس کے ساتھ تمام مچھلیاں بھی پالی جائیں جوغذائی ضرورت بھی پوری کر سکتی ہیں۔اس مقصد کے لئے تمام لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تا کہ وہ اس طرف مائل ہوں اورانہیں آمدنی کا ایک ذریعہ میسر آسکے۔مچھروں کے خاتمے کے لئے مئوثر دوائیں موجود ہیں کچھ دوائیں مچھر کے انڈوں وغیرہ کے خاتمے کیلئے چھڑ کی جاتی ہیں۔کچھ جسم پرلگائی جاتی ہیں، جن کے باعث مچھر کاٹنے سے باز رہتے ہیں۔ملیریا سے نجات اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کی پرورش اورافزائش کے تمام امکانات ختم ہو جائیں حاملہ خواتین کے لئے ملیریا انتہائی سنگین امکانات رکھتا ہے ماضی میں ملیریا کے باعث ہونے والی اموات میں عورتوں کی بڑی تعداد حاملہ عورتوں کی رہی ہے۔ملیریا کا شدت رکھنے والے علاقوں میں حمل کے ابتدائی چارتا پانچ ماہ عورت کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں عموماً پہلی بار حاملہ رہنے والی خواتین ملیریا کا آسان ہدف ہوتی ہیں۔ایسی ملیریا زدہ عورتیں تیز بخار یا جاڑے کا شکارنہیں ہوتی ہیں۔لہذا ایک معالج کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ وہ ملیریا میں مبتلا ہیں۔عالمی ادارہ صحت نے حاملہ خواتین کو ملیریا سے بچانے کے لئے خصوصی اقدامات پرزور دیا ہے جن میں ترجیح علاقے سے مچھروں کے خاتمے کو دی گئی ہے۔

ملیریا سے بچاؤ کے لئے ہمیں کیا کرنا ضروری ہے، یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے۔ غالباً یہ ممکن ہی نہیں کہ دنیا سے مچھر کا مکمل خاتمہ ہوسکے تاکہ ہم ان کی افزائش پر کنٹرول ممکن ہے۔ملیریا فرد انسانی صحت ہی پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے افرادی قوت کا نقصان بھی ہوتا ہے جو مجموعی طور پر قوتی آمدن کا نقصان ہے۔اس لئے اس سے بچاؤ کیلئے ان تدابیر کو اختیار کرنا بے حد ضروری ہے۔

☆کوؤں اور روشن دانوں میں جالی لگا کر گھروں کو مچھروں سے محفوظ بنایا جاسکتا ہے۔

☆ مچھروں سے بچاؤ کے لئے مختلف ادویہ موجود ہیں مگر انہیں احتیاط سے استعمال کرنا ضروری ہے۔

☆ مچھر عموماً شام ڈھلتے ہی گھروں کا رخ کرتے ہیں لہذا اس دوران احتیاط کی جائے کہ گھروں کے بیرونی دروازے بند رہیں۔

☆ایسے علاقے جہاں مچھروں کی کثرت ہو، وہاں مچھر دانی کا استعمال تحفظ فراہم کرتا ہے۔ملیریا سے تحفظ کے لئے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اقدامات کرنا بہت ضروری ہے ہر حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس ضمن میں مسئلے کی اہمیت تسلیم کرے اور خصوصی اقدامات کرے اور سرکاری سطح پر ملیریا کی مئوثر ادویہ کی آسان اور سستی فراہمی یقینی بنائی جائے۔

اگر ہم ملیریا سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں سخت احتیاط کرنا ہوگی دوسری صورت میں ملیریا کے باعث ہونے والی اموات اور نقصانات میں نا قابلِ تلافی اضافہ ہوسکتا ہے۔







# بیساکھی میلہ

## معلوماتی مضمون

سبین حیات

گودوارہ پنجہ صاحب دریائے جہلم کے اس پار سکون کا سب سے بڑا گودوارا ہے۔ شکل غیر معین ہے۔اس کا باہر سے گھیرا 396 غز ہے۔اس کے ہر طرف دو منزلہ کمرے ہیں۔کہیں کہیں زیر زمین بھی کمرے ہیں۔ بیچ میں میری ہر بندر، سرور، تالاب اور پنجہ صاحب ہیں۔ضسن ابدال کے بڑے بڑے چشموں کا پانی ندیوں کی شکل میں گودوارے میں داخل ہوتا ہے اور پھر عمارتوں کے نیچے بہتا ہوا چار ندیوں کی شکل میں باہر نکل جاتا ہے۔اس کے باہر تین طرف دکانیں بنی ہوئی ہیں۔گودوارا کی یہ وسیع وعریض قلعہ نما عمارت قصبے کے چھوٹے چھوٹے کچے پکے یک منزلہ مکانوں کے مقابلے میں ایک ایثار پیشہ اور محنتی اقلیت کو سرفراز کئے ہوئے تھی۔ اس گودوارے کی ملکیت میں حسن ابدال کی بیسوں دکانوں اور مکانوں کے علاوہ راولپنڈی، کیمبل پور اور حضرو میں بھی جائیداد تھی۔ بھائیاں پنجہ صاحب کو سکھ عید سے موضوع خورہ خیل ضلع کیمبل پور کے مالیے میں سے بارہ سو روپے ملتے تھے جو بعد میں نو سو روپے کر دیئے گئے۔1857 میں گوپال سنگو کو 250 اور باقی نرائن سنگھ کو ملتے تھے۔1878 میں ایشر سکھ کی وفات پر اس کا حصہ ضبط ہوا۔بعد میں گوپال سنگھ کی وفات پر اس کے حصے میں 27 روپے کمکر کے باقی 250 روپے گودوارے کے نام ہوئے۔ بندوبست 1909 میں گودوارے کے نام پانچ سو روپے تھے جو موضع حسن ابدال کے مالئے سے ملنی شروع ہوئی۔یہ رقم 1947 تک گودوارے کو ملتی رہی۔گودوارہ پنجہ صاحب میں راجہ رنجیت سنگھ کے جرنیل سرور ہری سنکھ نلوا نے بنوایا۔باوا پریم سنگھ ہوتی اپنی تالیف ہری سنگھ نلوا 1937 مین لکھتے ہیں۔

باواجی کی اس یادگار پر سردار ہری سنگھ نلوے نے ایک گودوارا بنوایا جسے انگلیوں کے نشان کی وجہ سے پنجہ صاحب کا گودوارہ کہتے ہیں۔رسالہ سکھ سلوک امرتسر کے پنجہ صاحب شمارہ نمبر 20 جولائی 1932 میں گیان ناہر سنگھ جی ایڈیٹر نے لکھا: مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں ہی سردار ہری سنگھ نلوے اور دوسرے سنگت سرداروں مہاراجہ پٹیالہ اور نابھ نے اس کودوارے کی سیوا کی۔

گودوارہ پنجہ صاحب کی عماروں میں کوئی عمارت بلکہ کوئی اینٹ بھی 1921 سے پہلے کی نہیں۔1920 میں اکالی قبضے کے بعد گودوارہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ تمام عمارتوں کو سمار کر کے وزیر نو ایک وسیع گودوارہ تعمیر کیا جائے۔کمیٹی کے رجسٹر کاروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے اصبدس منعقدہ 27 مارچ 1921 کی قرارداد نمبر 5 کی رو سے سردار ایشر سنگھ ساہنی (1848-1936) ولد سوبھا سنگھ رئیس اعظم حسن ابدال کی تعمیرات شروع کرنے کا اختیار دیا۔سردار ترلوک سنگھ پنجر ولد سردار مہر سنگھ نے 1930 میں گودوارا ٹربیونل کو بتایا کہ پہلی عمارت مغرب میں بنائی گئی۔اس کی تکمیل کے بعد دو تین سال میں لنگر کی عمارت بنائی گئی۔اس کے بعد مشرقی حصہ شروع کیا گیا۔ اخراجات سناتنی، سکھ اور ہندوؤں نے پورے کئے۔ پورپی حضرات نے بھی چندہ دیا۔

سکھ عہد حکومت میں یاک شخص مہر سنگھ ولد پیارا سنگھ بھون ضلع جہلم سے آیا اور اس پر قابض ہو گیا۔اس کے انتقال پر اس کے بھتیجے سردار ایشر سنگھ ساہی ولد مومبھا سنگھ ولد پیارا سنگھ کو ملی۔انہوں نے 15 جنوری 1901 میں مولا داد سے سات مرلے زمین خریدا اس کے چاروں طرف دیوار بنائی اور اسے بارہ دری میں شامل کر لیا 1927 میں ناہوں نے بارہ دری گودوارا کمیٹی کو دے دی۔1928 کو ایسے منہدم کر دیا گیا۔دوسری وسطی عمارتیں ہری ہرمندر، سرور، پونا اور پنجہ صاحب کی چھتری 1932 میں مسمار کر کے از سر نو بنائی گئیں۔نو تعمیر یہ منزلہ ہری ہرمندر کی مزرقی دیوار میں باہر کی طرف گورلکھی رسم الخط میں کتبہ نصب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سنگ بنیاد 463 نانک شاہی یعنی 1932 میں رکھا گیا۔ یہ مندر رنجیت سنگھ کی سمادھی واقع لاہور کے نمونیپر بنایا گیا۔سرور کے مزرقی طرف اس کا انگریزی رسم الخط میں سنگ بنیاد نصب ہے۔ یہ سنگ بنیاد ڈکایداورندر سنگھ ولی عہد پٹیالہ نے 14 اکتوبر 1932 میں رکھا۔ان دنوں سر سکندر حیات کان کے برادر بزرگ سر لیاقت حیات خان (1886-1948) وزیر اعظم پٹیالہ تھے۔ولی عہد کو جو عصرانہ دیا گیا اس میں مسلمان معززین بھی مدعو تھے۔

# پھول

پھولوں پھلوں اور سبزیوں کی سالانہ نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے ایک صاحب نے پھولوں، پھلوں اور سبزیوں کی اقسام میں مزید ترقی پر زور دیا اور اس دوران کہا کہ پھول محبت کے مظہر ہیں اور ہمارے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ بالکل درست ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پول محبت کا مظہر ہیں تو پھل کسی کا مظہر ہیں اور خاص طور سے سبزیاں کیس کا مظہر ہیں؟ نمایش تینوں چیزوں کی تھی مگر اخبار میں جو پورٹ شائع ہوتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب نے صرف پھولوں کو جذبات محبت کا مظہر قرار دیا پھل سبزیاں انکی طرف بایں پھیلائے رہ گئیں۔ پھول محبت کے بہت بلیغ اشارے ہوتے ہیں، اور بعض اوقات تو یہ اشارے بہت کاری بھی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک نوجواں جولہولہان ہو رہا تھا بازار میں سے سیٹی بجاتا ہوا گزرا کسی نے اسے روک کر پوچھا کہ میاں خون تمہارے ماتھے اور سر سے بہہ رہا ہے، مگر تم یوں خوش ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ آخر کیوں خوش ہو؟ نوجوان نے جواب دیا۔ "ابھی ابھی میں اپنی محبوبہ کی گلی سے آرہا ہوں، میں نے آج اسے مدتوں کے بعد دیکھا ہے وہ بھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اس خوشی میں مجھ پر پھول پھینکے مگر جلدی میں تھی اسلئے وہ یہ پھول گملے سمیت پھینک بیٹھی! بہرحال حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ اگر پھول محبت کا مظہر ہوتے ہیں تو سبزیاں اور پھل کس کے ہوتے ہیں؟ پھلوں کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں سردے گرمے سے لیکر فالسہ تک شامل ہے، ظاہر ہے کہ ہر پھل کسی چیز یز کا مظہر ہوگا مگر یہاں ہمیں ایک حکایت یاد آرہی ہے کہ ایک بادشاہ نے ہر پیشہ کے ایک ایک نمائندے کو اپنی اپنی پسند کی سبزی ہاتھ میں لے کر دربار میں حاضری کا حکم دیا کہ ظل الٰہی کو جو سبزی پسند آگئی، اس کے مالک کو مالا مال کر دیا جائے گا اور اس روز بادشاہ شاید ملکہ سے جھگڑ کر آیا تھا جوں ہی دربار میں قدم رکھا حکم صادر کیا کہ ہر سبزی اس کے مالک کے منہ میں ٹھونس دی جائے۔ پیاز لانے والے کے منہ میں پیاز ٹھونس دی گئی تو اس نے دو تین بار جبڑا مارا اور پیاز نگل گیا، اسی طرح دوسری سبزیوں کے ساتھ سلوک کیا گیا۔ مگر جب اس شخص کی باری آئی جو ایک ککڑی لایا تھا تو ککڑی اس کے حلق میں اتاری جارہی تھی اور وہ مارے ہنسی کے بے حال ہوا جارہا تھا۔ بادشاہ کو اس پر بہت غصہ آیا، کڑک کر بولا عجیب بے حیا آدمی ہو! تمہارے ساتھ بھرے دربار میں یہ سلوک ہو رہا ہے اور تم ہنس رہے ہو۔ اس پر وہ شخص بولا: جہاں پناہ! مجھے اپنے آپ پر تو ہنسی نہیں آرہی ہے مجھے تو اس شخص پر ہنسی آرہی ہے جو میرے عقب میں آدھے من کا پیٹھا اٹھائے کھڑا ہے، بے چارہ"۔ تاریخ انسانی کی ابتداء میں جس شخص کو بھی محبت اور عقیدت کے اظہار کے لئے پھول پیش کرنے کی سوجھی تھی، وہ بڑا ہی بازدق آدمی تھا، اگر وہ پھولوں کی بجائے سبزیوں کو اس مقصد کے لئے استعمال کرتا تو آج اس قسم کے مناظر دیکھنے میں آتے کہ ہوائی اڈے پر غیر ملکی معزز مہمانوں کا انتظار ہو رہا ہے اور لوگ مولیوں اور گاجروں، کدوؤں اور ککڑیوں، ٹنڈوں اور پیازوں، گوبھیوں اور پیٹھوں تک کے ہار لئے کھڑے ہیں تا کہ ادھر مہمان زمین پر قدم رکھے، ادھر اسے ان نذرانہ ہائے عقیدت سے لاد دیا جائے۔ خدا کا شکر کیجئے کہ گوبھیوں کے پھول کو داناؤں نے سبزی میں شامل کیا ہے اور نہ صورت حال یہ ہوتی کہ عشاق فرط محبت سے محبوبہ کے جوڑے میں گوبھی کے پھول سجاتے پھرتے اور مصنوعی جوڑے گوبھی کے ساتھ ہی سر سے الگ ہو کر زمین پر آرہتے۔ بڑے بڑے لوگوں کو گلاب کے پھولوں کے گلدستے کی بجائے گوبھی کے پھولوں کا ٹوکرا اندر کیا جاتا اور درزیوں کو کوٹوں کے کالروں میں اتنے بڑے بڑے کاج بنانے پڑتے جن میں شائقین گوبھی کے پھول آسانی سے اٹکا سکیں۔ افواہ ہے کہ ایک بار ایک صاحب نے عام دنیا سے مختلف نظر آنے کے لئے اپنی منگیتر کو سورج مکھی کا ایک فٹ قطر کا پھول نذر کیا تھا۔ بھری مجلس میں بے چاری لڑکی اس ہتک پر احتجاج تو نہ کر سکی البتہ پلٹ کر اپنے باپ سے یہ ضرور کہا کہ "ڈیڈی! ایک بیل گاڑی بھی منگوالیجئے تا کہ ہم گھر واپس جائیں تو سورج مکھی کا یہ پھول لاد کر لے جائیں"۔

کل شام میں اپنی زندگی کے ایک انوکھے تجربے سے دوچار ہوا جمعہ کا روز تھا اور دفتر میں چھٹی تھی۔ دن بھر گھریلو کام نمٹانے کے بعد یہی جی میں آئی کہ اب بازار چلیں اور مون سائن کی بہار دیکھیں جمعہ کے روز بازار جانے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ کچھ نئی کتابیں خریدی جائیں اور زندگی کے کچھ لمحات دانشوران عالم کے ساتھ گزارے جائیں۔ اس روز جب میں کتابوں کی دکان پر پہنچا تو دکاندار نے میرے سامنے ایک ایسی کتاب رکھ دی، جسے میں عرصے سے تلاش کر رہا تھا۔ یہ نایاب کتاب دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور میں اسے کھول کر دیکھے بغیر ہی دس روپے میں خرید کر گھر لے آیا۔ گھر پہنچتے ہی میں نے اشتیاق سے کتاب کو کھولا تو حیران رہ گیا کہ یہ کتاب نئی نہیں بلکہ سیکنڈ ہینڈ تھی۔ اس کے اوراق پر کہیں کہیں پنسل کے نشانات لگے ہوئے تھے اور سرورق کے اندرون گوند سے چپکایا ہوا ایک ورق اترا ہوا تھا۔ معاً بجلی کی طرح ذہن میں یہ خیال کوندا کہ یہ کتاب تو کسی لائبریری سے چرائی گئی ہے اور کوئی نا ہنجار اپنی معمولی سی ضرورت پوری کرنے کے لئے دکاندار کے پاس فروخت کر گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میری کیفیت بدل گئی اور ذہن پر ایک بوجھ سا آگرا۔ لائبریریاں انسانی دانش کی تربیت گاہیں ہیں، ان میں کتابیں اس لئے محفوظ کی جاتی ہیں تا کہ بنی نوع انسان ان سے استفادہ کر سکے اور ان مصنفوں تک جواب نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں، ہر شخص رسائی حاصل کر سکے، لائبریری سے چرائی ہوئی کتاب ایسے ہی ہے جیسے دانش کا خزانہ خالی کر دیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کھلے بازا سے خریدی ہوئی کتاب نے میرے ذاتی کتب خانے کا زینت بڑھادی تھی لیکن ذاتی کتب خانہ کتاب کے اس مصرف کو پورا نہیں کرتا جو لائبریری سے پورا ہوتا ہے لائبریری ایک اجتماعی ادارہ ہے۔ لائبریری روشنی کا ایک ایسا ماخذ ہے جس سے نور کی کرنیں ہر جانب بکھرتی ہیں اور جس کی روشنی میں بنی نوع انسان کا ہر فرد اپنا فکری سفر جاری رکھ سکتا ہے۔ لائبریری دانشوران عالم کی مجلس ہے، ایسے دانشور۔ جن کی صحبت میں بیٹھ کر زندگی کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھائی جاسکتی ہیں۔ یہ کتاب بھی زندگی کا ایک معاون جزو تھی۔ لیکن اب ایک غیر زمہ دار شخص نے اس کتاب کو اپنے اصلی مقام سے ہٹا دیا تھا اور یہ ایک محبوس پرندے کی طرح میرے کمرے کی چار دیواری میں اداس نظر آتی تھی۔ یہ کتاب اس گھر میں تنہا تھی اور مجھے یقین ہے کہ اس کے بغیر لائبریری کا وہ کونہ بھی اداس ہوگا جہاں یہ کچھ عرصہ قبل پڑی تھی۔ میں نے دیکھا، رات کے سائے ابھی زیادہ نہیں اترے تھے، میں نے کپڑے تبدیل کئے اور واپس بازار کی طرف چل دیا۔ میں نے دکاندار سے جھگڑتے ہوئے پوچھا۔ تم لائبریریوں سے چرائی ہوئی کتابیں بیچتے ہو؟ تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم معاشرے کے غیر ذمہ دار فرد ہو، تم مجرم ہو، لیکن میری اس تلخ کلامی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے کتاب میرے ہاتھوں سے لے لی، اسے میز کی نچلی طرف رکھا اور میری طرف دس روپے کا نوٹ بڑھا دیا لیکن اب یہ دس روپے میرے لئے مٹی کے ٹھیکرے کے برابر تھے۔ کاش مجھے پتہ ہوتا کہ یہ کتاب کسی لائبریری سے چرال گئی ہے اور میں دوکاندار کو لوٹانے کے بجائے اسے اپنے اصلی مقام پر رکھ کر ایک گم شدہ مسرت حاصل کر لیتا۔

# خاکہ:

# آپ اور ہم

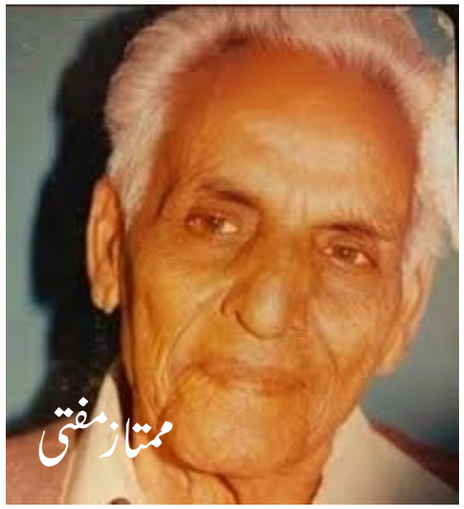


میاں: سیماں سیماں پتہ نہیں کہاں چلی جاتی ہے ایک تو ان عورتوں کو باتیں سننے اور کرنے کی لت پڑی ہے جہاں بیٹھ گئیں تو بیٹھ گئیں، پھر باتوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔

بیوی (داخل ہوکر): جب میاں دفتر کی فائیلیں سامنے رکھ کر بیٹھ جائے تو بیوی کیا کرے۔ یہ بتاؤ مجھے۔

میاں: (ہنستا ہے) ایک منٹ باتیں کئے بغیر رہا نہیں جاتا تم سے۔

بیوی: نہیں رہا جاتا۔ کرلو کیا کرنا ہے میرا۔

میاں: کہاں گئی تھیں (ہنس کر) میں آوازیں دے کر تھک گیا۔

بیوی: چوہدریوں کے ہاں گئی تھی، وہ عمرہ کرنے جارہے ہیں ناں۔

میں: کب جارہے ہیں۔

بیوی: اگلے ہفتے

میاں: ہاں بھئی امیر لوگ ہیں۔ کیوں نہ جائیں عمرہ کرنے۔

بیوی: کیوں فرض نہیں ہے کیا؟

میاں: ہے ضرور۔ جن کے پاس پیسہ ہو ان پر حج فرض ہے۔

بیوی: آجکل مہمانوں میں اس قدر جذبہ ہے کہ مدینے جانے کا پیسہ ہو وہ دھڑا دھڑ جارہے ہیں۔

میاں: پاکستان کو دعائیں دو بی بی۔

بیوی: وہ کس لئے؟

میاں: جب سے پاکستان بنا ہے مسلمانوں کے ہاں پیسوں کی ریل پیل ہوگئی ہے نا اس لئے_____

بیوی: پہلے نہیں تھی کیا؟

میاں: پاکستان بننے سے پہلے تو مسلمانوں کی بری حالت تھی۔

بیوی: پر وجہ کیا۔

میاں: مسلمانوں کو تجارت میں جانے نہیں دیتے تھے۔

بیوی: کیوں نہیں جانے دیتے تھے؟

میاں: مسلمانوں میں تعلیم عام نہیں تھی اس لئے انہیں اچھی ملازمتیں نہیں ملتی تھیں مسلمان زمینوں پر کام ضرور کرتے تھے لیکن زمین غیر مسلموں کی تھی۔ پر یہ بھی کہ ان دنوں حج پر جان اتنا آسان نہیں تھا

۔

بیوی: کیوں ہوائی جہاز نہیں تھے کیا؟

میاں: میں ان دنوں لوگ سمندری جہاز پر جایا کرتے تھے۔ عرب میں پہنچ کر پھر قافلوں میں سفر کیا کرتے تھے۔

بیوی: پیدل جاتے تھے کیا؟

میاں: ہاں پیدل، اونٹوں پر، گھوڑوں پر، مدینے شریف پہنچنے میں مہینوں لگتے





تھے۔

بیوی: پھر حج کرنا تو بڑا مشکل کام ہوگا ان دنوں۔

میاں: بہت مشکل۔

بیوی: میرا بھی جی چاہتا ہے کہ حج کرنے جاؤں۔

میاں: جائیں گے۔ جائیں گے ضرور ضرور جائیں گے۔

بیوی: جب بوڑھی ہوجاؤں گی تب!

میاں: بالکل نہیں۔ تجھے پتہ ہے سیماں اب تو بوڑھے آدمیوں اور عورتوں کو حج پر بھیجتے ہی نہیں۔

بیوی: وہ کیوں؟

میاں: حج کرنا بوڑھوں کے بس کی بات نہیں۔

بیوی: کیوں!

میاں: بھئی حج میں بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے صرف صحت مند لوگ اس کے متحمل ہوسکتے ہیں۔

(دروازہ بجتا ہے)

بیوی: کون ہے دروازے پر۔

حمیدا: میں حمیدا ہوں بھابھی (باہر سے آواز)

بیوی: تو دروازہ کیوں بجا رہا ہے خوانخواہ۔ اب اندر آ

حمیدا: اسے کھولوں تو آؤں ناں۔

بیوی: (قہقہہ) تیرا بھی جواب نہیں لڑکے۔

میاں: بھئی دروازہ تو کھلا ہے حمیدے۔

حمیدا: (داخل ہوکر) بھئی بڑی مشکل سے کھلتا ہے یہ آپ کا دروازہ۔

بیوی: آجا بیٹھ جا۔ کیسے آیا ہے تو خیریت سے تو ہے نا۔

حمیدا: بیگار پر ہوں بھابھی۔

بیوی: کیا مطلب؟

حمیدا: میرے دفتر کا صاحب جو ہے نا اس نے میری ڈیوٹی لگادی ہے کہ اس کے ویزے کا انتظام کروں۔

بیوی: ویزا کیا ہوتا ہے؟

میاں: باہر کے ملکوں میں جانے کا پروانہ ہوتا ہے بیوی۔

بیوی: کہاں جارہا ہے تیرا صاحب؟

حمیدا: جاتو رہا ہے فرانس، پر کہتا ہے عمرہ کروں گا پھر فرانس جاؤں گا۔

بیوی: عمرہ کرنے کا جذبہ تو ہوتا ہے نا ان میں۔

حمیدہ: ہاں یہ تو ہے۔

بیوی: اندر ایک تڑپ ہو جبھی جاتا ہے نا انسان۔

میاں: ٹھیک کہتے ہو تم۔

بیوی: اور پھر وہاں جانے کا موقع ملتا ہے دل میں عاجزی پیدا ہوتی ہے۔ کہتے ہیں اللہ کے گھر کو دیکھ کر دل میں ایسی عقیدت پیدا ہوتی ہے جیسے دل کے تار چھڑ گئے ہوں۔ یہ کیا کم ہے۔

حمیدا: یہی تو ساری بات ہے بھابھی۔ جب نہیں گیا تھا وہاں۔

بیوی: ہائیں تو گیا تھا کب گیا تھا وہاں؟

حمیدا: جب ابا اماں گئے تھے تو وہ مجھے ساتھ لے گئے تھے۔ ان دنوں میں بی اے میں پڑھتا تھا۔

بیوی: بڑا خوش قسمت ہے تو رے۔

حمیدا: اس وقت مجھے احساس نہیں تھا مگر اب ہے۔

میاں: وہاں جا کر کیا محسوس کیا تو نے!

حمیدا: پہلے تو میں حرم شریف دیکھ کر میں بڑا حیران ہوا۔

بیوی: کس بات پر حیران ہوا؟

حمیدا: میرا خیال تھا کہ چودہ سو سال پرانی عمارت ہوگی لیکن دیکھا تو اتنی بڑی شاندار مسجد ہے اور اس کے ارد گرد اونچے اونچے فائیو اسٹار ہوٹل ہیں۔ میں تو ہکا بکا رہ گیا۔

بیوی: سچی۔

حمیدا: بالکل بھابھی۔مکہ شریف تو ایسا خوبصورت شہر ہے کہ وہ پرانا دقیانوسی مذہب نہیں ہے۔اسلام تو ماڈرن مذہب ہے ماڈرن۔

بیوی: یہ تو کیا کہہ رہا ہے حمیدے؟

میاں: دیکھ میری بات کو سمجھ۔

حمیدا: سمجھا میں بھی نہیں۔

میاں: اسلام واحد مذہب ہے جو آج کی زندگی پر بھی پورا اترتا ہے جوں جوں ہم ترقی کرتے جاتے ہیں۔توں توں اسلام ماڈرن لوگوں کے لئے قابل قبول مذہب بنتا جاتا ہے۔اس لئے کہ اسلام کی ریپرٹ ایسی ہے جسے ماڈرن لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

بیوی: کیا سچ کہہ رہے ہو؟

میاں: مساوات اور واحدنیت کا مفہوم ماڈرن مین ہی سمجھ سکتا ہے۔جبھی تو آج کل یورپ میں لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہو رہے ہیں۔

حمیدا: یہ تو میں نے بھی پڑھا ہے اخباروں میں۔

بیوی: یہ کیا سچی بات ہے؟

حمیدا: بھابھی اخباروں میں خبریں آتی رہتی ہیں۔

بیوی: اچھا حمیدے یہ بتا کہ مکہ شریف میں اور تو نے کیا کچھ دیکھا؟

حمیدا: بھابھی میرا خیال تھا کہ میں ایک ریگزار میں جا رہا ہوں پر جب وہاں پہنچا تو چاروں طرف سنگ مرمر کی خوبصورت دیواریں، مینار اور روشنیاں ہی روشنیاں تھیں حرم شریف جگمگ کر رہا تھا۔بجلی کے پنکھے ہی پنکھے ہزاروں پنکھے اور سڑکیں شفاف سڑکیں، شیشے کی طرح صاف ہموار اور ان پر موٹریں بھاگ رہی تھیں۔

میاں: بھئی بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بیوی: نہ بولو بیچ میں۔

حمیدا: ایسا لگتا تھا جیسے ایک عظیم شہر میں آ گیا ہوں۔

میاں: وہ تو ہے بھئی اسلام دنیا کا مستقبل ہے۔

حمیدا: وہ کیا بات ہوئی!

میاں: جو جوں وقت گزرے گا۔اسلام کی عظمت دنیا والوں کے سامنے حقیقت بن کر آئے گی۔

بیوی: حمیدے تو بتانا۔پھر جب تو نے خانہ خدا کے سامنے پہنچا تو کیا ہوا؟

حمیدا: بھابھی خانۂ خدا کے سامنے جا کر آدمی کو تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔جذبات کا ایک طوفان چلتا ہے۔آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے۔

بیوی: سارے لوگ یہی کہتے ہیں۔

حمیدا: سچ کہتے ہیں بھابھی۔وہاں جا کر عجب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

میاں: اور حج کے موقع پر، جب لاکھوں مسلمان اپنے اللہ کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں تو۔۔۔۔۔۔۔۔

حمیدا: عجب سماں ہوتا ہے بھابھی۔۔۔۔عجب سماں

بیوی: میں نے کہا حمیدے چل ہم بھی عمرہ کر آئیں۔

میاں: جائیں گے جائیں گے انشاءاللہ۔

اسلام کا مستقبل بہت درخشاں ہے

بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ

اسلام دنیا کا مستقبل ہے۔

انسان نے فطرت سے بغاوت کر کے اب ایسا طرز زندگی اپنایا ہے کہ اس نے اس کی صحت کے لیے ہزار خطرات پیدا کر دیے ہیں۔اب ذرا غور کیجئے کہ انسان جس کا حصولِ حیات یہ تھا کہ "حرکت میں برکت" وہ اب جامد ہو کر رہ گیا ہے۔کرسی اسے کیا ملی کہ اس کا ہو کر رہ گیا ناہلتا ہے نہ جلتا ہے بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی ذرا سا جھٹکا لگا کوئی نہ کوئی درد ہو گیا، ذرا جھک لیا کمر کا درد ہو گیا، کمر کے درد کی ایک اہم ترین صورت یہ ہے کہ بیٹھے لیٹے اور کھڑے ہونے میں صحیح انداز اختیار نہ کرنے سے کمر پر زور پڑ سکتا ہے یا بوجھل چیز مثلاً پانی کی بالٹی یا کسی بھاری باکس کو اٹھانے سے یا کسی بوجھل چیز کو کھینچنے یا دھکیلنے سے بھی زور پڑ سکتا ہے اور کمر کا درد ہو سکتا ہے۔خواتین میں خاص طور پر اب مردوں میں بھی کمر کا درد واقع ہو سکتا ہے جو ذرا اونچی ایڑی کے جوتے پہنتے ہیں مردوں کے لیے یہ اونچی ایڑی کے جوتے پہننا فطرت کی خلاف ورزی ہے۔جہاں تک بیماریوں کا تعلق ہے گردے کی تکلیف سے کمر کا درد ہو سکتا ہے خواتین کی مخصوص بیماریوں میں مثلاً خرابیاں ایام کی صورت میں بھی کمر کا درد ہو سکتا ہے۔اس طرح پتے کی پتھری اور معدے کی تکلیفوں میں بھی شکایت پیدا ہو سکتی ہے نمونیا، انفلوئنز، املیریا اور چیچک میں درد کمر کی شکایت پیدا ہو سکتی ہے۔خاص طور پر روماتزم اور جوڑوں کا درد ایسی بیماریاں ہیں جن سے کمر بہت متاثر ہوتی ہے۔ایک بات جو اور کے جو اس سلسلے قابل ذکر ہے وہ ریڑھ کی ہڈی کے کسی مہرے کا اپنی جگہ جگہ سے سرک جانا بوڑھے آدمیوں میں ریڑھ کی ہڈی ٹیڑھی بھی ہو سکتی ہے اور کسی بھی چیز سے جسے عام لوگ بیان کرتے ہیں کہ کمر گرم سرد ہو جاتی ہے مثلاً پسینہ آیا ہوا اور پھر اسے ہوا لگ جائے تو کمر کا درد پیدا ہو جاتا ہے۔ان مختلف اسباب سے واضح ہے کہ درد کمر کی اصل سبب کا علاج کرنا چاہیے اگر گردے پتے وغیرہ کی تکلیف یا روماتزم اور جوڑوں کے درد کا مرض ہے تو ان کا علاج کرانا چاہیے جس سے دردِ کمر خود بخود رفع ہو جائے گا۔ریڑھ کی ہڈی کے مہرے کا سرک جانا ایک الگ مرض ہے جو خصوصی توجہ چاہتا ہے اس کے لیے معالج سے رجوع کرنا ضروری ہے۔یہ صورتحال عرق النساء کا مرض پیدا کر سکتی ہے جو بڑا تکلیف دہ ہے، جو لوگ مسلسل بیٹھ کر کام کرتے ہیں مثلاً دفاتر کے حکام ٹائپسٹ وغیرہ انہیں چاہیے کہ صبح یا شام ورزش کریں کسی پاک صاف اور تازہ ہوا والی جگہ پر چہل قدمی کریں یا دوڑ لگائیں۔خواتین یا مرد جو اونچی ایڑی کے جوتے پہنتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ جن اشخاص کو خواہ وہ مرد ہو یا خواتین کسی وجہ سے دردِ کمر نہیں بلکہ دن بھر بیٹھنے سے یا غلط انداز سے بیٹھنے لیٹنے اور چلنے کی وجہ سے یہ تکلیف ہے۔انہیں چاہیے کہ وہ اپنے معالج سے مشورہ کر کے ایک ورزش ضرور کریں۔معالج آپ کو کوئی ایسی آسان ورزش بتا سکے گا جو صبح بستر سے اٹھنے سے پہلے سے اٹھتے وقت آپ 10 سے 15 منٹ کر لیں گے اور دن بھر چاق و چوبند رہیں گے ایک چیز جس کی ہماری ثقافت میں بہت ضرورت ہے وہ ہے صبح یا شام کو ہلکی دوڑ یا لمبی چہل قدمی، چلنے میں بدن کے تقریباً تمام جوڑ اور پٹھے حرکت کرتے ہیں اور تمام اعضاء کو ورزش ملتی ہے۔زیادہ سے زیادہ تازہ ہوا پھیپھڑوں میں جاتی ہے دن بھر کی تکان دور ہو جاتی ہے اور بدن میں تازگی آ جاتی ہے۔پیدل چلنے یا دوڑنے کے لیے کسی سامان کی یا کسی بھی تکلفات کی ضرورت نہیں نیز اس میں کھیل جیسی پابندیاں بھی نہیں ہوتیں۔لہذا ہر آدمی اسے با سہولت کر لیتا ہے۔جسمانی فائدوں کے علاوہ نفسیاتی فوائد کے لحاظ سے چہل قدمی ایک اچھی عادت ہے آدمی دن بھر کے فکر و غم اور دباؤ اور تناؤ سے آزاد ہو جاتا ہے جس سے بدن کو سکون ملتا ہے۔

# پاکستان براڈکاسٹنگ اکیڈمی میں جامع ٹریننگ پروگرام کے انعقاد کی افتتاحی تقریب

رپورٹ: سینئر پروڈیوسر محمد عامر سعید

ریڈیو پاکستان ٹریننگ پروگرام رائڈ اپ پاکستان براڈکاسٹنگ اکیڈمی نے حال ہی میں ایک جامع ٹریننگ پروگرام کا انعقاد کیا۔اس پروگرام کا مقصد پاکستان بھر سے براڈکاسٹنگ کے شعبے میں دلچسپی رکھنے والے افراد کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کے علاوہ ان کی فنی مہارتوں میں نکھار پیدا کرنا تھا۔اس پروگرام میں ریڈیو براڈکاسٹنگ سے متعلقہ تمام اصناف کو مدنظر رکھتے ہوئے اسپیشل کورسز جن میں آر جے۔ڈی جے شپ ،اینکرنگ، میوزیکالوجی 'پوڈکاسٹ ،ٹرانس میڈیا سٹوری ٹیلنگ ، الیکٹرک جرنلزم اور کمپیئرنگ کو شامل کیا گیا ۔ریڈیو پاکستان ٹریننگ پروگرام اس حوالے سے بھی منفرد تھا کہ اس میں پاکستان بھر سے 100 شرکا آن لائن تربیت کا حصہ تھیجب کہ راولپنڈی اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے 20 شرکا نے باضابطہ طور پر تربیت میں شرکت کی۔رواں سال 26 فروری کو شروع کیئگیئے اس پروگرام میں ریڈیو براڈکاسٹنگ سے تعلق رکھنے والے جید براڈکاسٹرز کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا جنہوں نے مختلف سیشنز میں اپنے فنی تجربے کی روشنی میں موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جدید اور بااثر پروفیشنل جہتوں کے حوالے سے رہنمائی اور آگاہی فراہم کی اور کورس کے شرکا کو خصوصی لیکچر بھی دیے۔پروگرام کے افتتاحی سیشن میں ڈائریکٹر جنرل پی بی سی نے عصر حاضر میں ذرائع ابلاغ اور صحافت کے شعبوں میں تحقیق اور ڈیٹا تجزیے کی اہمیت کے موضوع پر خصوصی لیکچر دیا اور جدید دور میں با اعتماد براڈکاسٹنگ کی اہمیت اور ضرورت پر شرکا سے تبادلہ خیال کیا جو کہ ڈی جی پی بی سی کی اس پروگرام میں ذاتی دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔پروگرام کی اِفتتاحی تقریب میں نگران وزیر اطلاعات و نشریات مرتضی سولنگی نے خصوصی شرکت کی اور پروگرام کا افتتاح کیا،اس موقع پر مختصر خطاب کرتے ہوئے جناب مرتضی سولنگی نے اس ٹریننگ کورس کو شرکا کیلئے سنہری موقع گردانتے ہوئے شرکا کے لئے اس کی افادیت واہمیت پر روشنی ڈالی اور سے پروگرام سے استفادہ کرنے پر زور دیا۔اسٹیشن منیجر سی آر آئی ایف ایم 98 مس Du Jianing نے اپنے افتتاحی لیکچر میں انٹرنیشنل براڈکاسٹنگ کے حوالے سے بات کی اور ٹریننگ کے آغاز وانعقاد کو سراہا۔دیگر تربیت کاروں میں سابق ڈائریکٹر پروگرامز جناب ڈاکٹر الطاف احمد شاہ ،جناب رفعت قیوم ،جناب عبدالوحید شیخ ،ڈائریکٹر نیوز ڈاکٹر امان اللہ سپرا ،سابق اسٹیشن ڈائریکٹر اسلام آباد جناب فیاض کیانی ،معروف صحافی اور تجزیہ نگار اعزاز سید صحافی و تجزیہ نگار عمر چیمہ ،کنٹرولر سوشل میڈیا ریڈیو پاکستان اسما حفیظ ، معروف ٹی وی میزبان توشیق حیدر، نامور مصنف اور میزبان شمعون ہاشمی ،مشہور نیوز کاسٹر عشرت ثاقب ، ماہر تعلیم محترمہ فریحہ طاہر ،معروف براڈکاسٹر تصور زمان بابر، نیوز کاسٹر دمن زمان اور ریڈیو سے وابستہ عمر شبیر گھمن نے کورس کے شرکا کے ساتھ خصوصی سیشنز میں شرکت کی۔اس پروگرام کی فوکل پرسن صدف رانی) پروگرام

مینجر (اوران کی ٹیم پروڈیوسر عمران منور، انعام سومرو اور شہزاد غوری نے بھرپور تعاون کرتے ہوئے مختلف طبقہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والوں کو لیکچرز کے لئے مدعو کیا۔جبکہ اس ٹریننگ کی کوآرڈینیشن اور انتظامات کیلئے ہما طارق اور محمد عامر سعید پی بی اے کی جانب سے ہما وقت موجود رہے۔ 26 فروری 2024 کو شارٹ کورسز ٹریننگ پروگرام کے نام سے شروع ہونے والا یہ پروگرام کنونشنل لیکچرز کے ساتھ ساتھ ہینڈز آن ٹریننگ پر مشتمل تھا یہ کورس 21 مارچ 2024 کو پی بی اے میں منعقد اختتامی تقریب کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچا۔اختتامی تقریب سے پرنسپل پی بی اے ڈاکٹر جاوید خٹک نے اپنے خیر مقدمی خطاب میں عرصہ دراز سے غیر فعال اکیڈمی کو فعال بنانے کے حوالے سے ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کے شبانہ روز کاوشوں کو سراہا انہوں نیکہا اگر مستقبل میں بھی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کی طرف سے اکیڈمی میں تربیتی سیشنز اور اکیڈمی کی کارکردگی مزید بہتر بنانے کیلئے تعاون شامل حال رہا تو ہم اکیڈمی کو ایک مثالی ادارہ بنانے کیلئے ہر ممکن اقدام کریں گے۔اختتامی تقریب سے ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جناب سعید احمد شیخ نیا پنے خطاب میں کہا کہ اکیڈمی میں تربیتی کورسز کے اس سلسلے کو مستقبل میں بھی جاری رکھا جائے گا۔اس اقدام سے براڈکاسٹنگ کے مختلف شعبوں میں دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کو اپنی صلاحیتوں میں اضافے کا موقع ملے گا۔انہوں نے پاکستان براڈکاسٹنگ اکیڈمی کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے امید ظاہر کی کہ یہ پروگرام شرکا کے پروفیشنل کیریئر کو نکھارنے میں مثبت کردار ادا کرے گا۔آخر میں کورس کے شرکا میں سرٹیفکیٹس تقسیم کیے گئے اور افطار ڈنر کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔

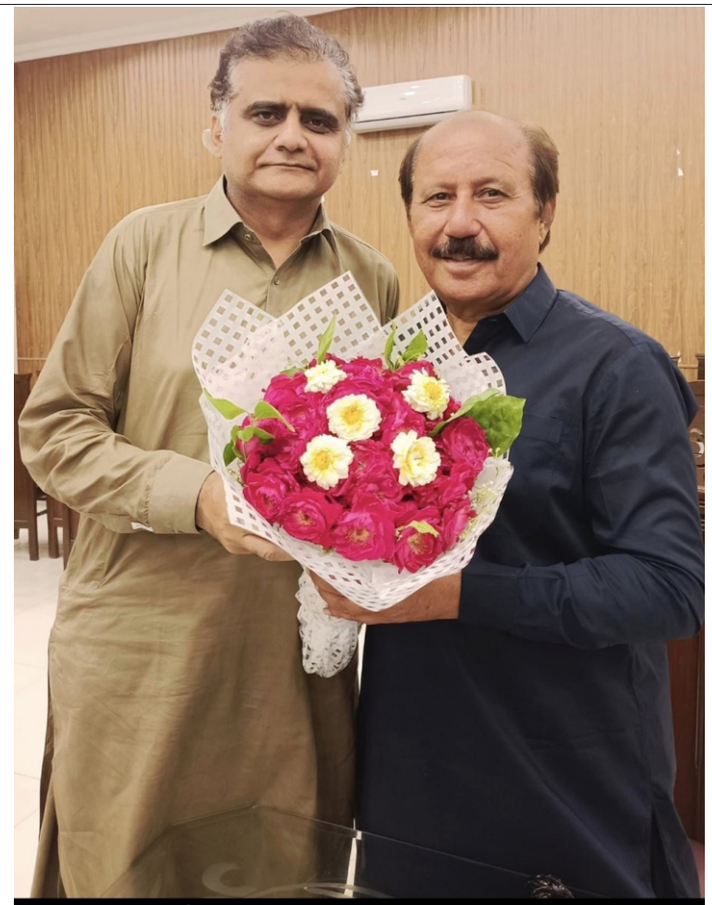

ادب کے شعبے میں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سال 2024 حاصل کرنے پر ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے سابقہ اسٹیشن ڈائریکٹر نصیر مرزا کو اسٹیشن ڈائریکٹر ڈاکٹر علی اکبر ہنگورجو پھولوں کا تحفہ پیش کرتے ہوئے

علی دوست عاجز (پرائڈ آف پرفارمنس) سے ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے اسٹوڈیو میں نوشابہ ظفر انٹرویو لیتے ہوئے

قادر بخش مٹھو (پرائڈ آف پرفارمنس) سے ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے اسٹوڈیو میں ڈاکٹر فاروق ٹاپر انٹرویو لیتے ہوئے

علی دوست عاجز ادب کے شعبے میں بطور شاعر صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سال 2024 حاصل کرنے پر ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے اسٹوڈیو میں اسٹیشن ڈائریکٹر ڈاکٹر علی اکبر ہنگورجو گلدستہ پیش کررہے ہیں، ساتھ میں ریڈیو پاکستان حیدرآباد کی ٹیم بھی موجود ہے

صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سال 2024 حاصل کرنے پر مزاحیہ فنکار قادر مٹھو کو اسٹیشن ڈائریکٹر ڈاکٹر علی اکبر ہنگورجو سندھ کارواجی تحفہ اجرک پیش کرتے ہوئے، ساتھ میں ریڈیو پاکستان حیدرآباد کی ٹیم بھی موجود ہے

# خواتین کے عالمی دن کے موقع پر خصوصی پروگرام

رپورٹ: محمد اظہر

خواتین کے عالمی دن کے موقع پر ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں ایف ایم۔ون او ون میں خواتین کے لیے سپیشل تقریبات کا اہتمام ہوا۔مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی خواتین نے پروگرام میں شرکت کی۔

خواتین زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں کارکردگی سرانجام دے رہی ہیں آج کے ترقی یافتہ دور میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔آج خواتین میں خواہ وہ طالب علم ہوں، گھریلو خواتین ہوں یا نوکری پیشہ خواتین۔ پاکستان کی تعمیر و ترقی اور بہتر معاشرے کی تشکیل میں بھرپور حصہ ڈال رہی ہے۔اس سال خواتین کے عالمی دن کی تھیم ہے۔"مساوات"

پروگرام کی میزبان صدف رانی نے تمام خواتین کو سٹوڈیوز میں خوشامدید کہتے ہوئے ایف ایم۔ون اوون کی کنٹرولر متحرمہ عاصمہ گل سے گفتگو کا آغاز کیا اور ان سے انکی کامیابی کے سفر پر بات کی۔ عاصمہ گل نے بتایا کہ جس وقت انہوں نے ریڈیو پاکستان جوائن کیا تو براڈ کاسٹنگ کی فیلڈ میں خواتین نہ ہونے کے برابر تھیں اور خاص طور پر ڈی آئی خان جیسے سٹیشن پر بطور پروڈیوسر جہاں صرف وہ ہی ایک خاتون تھیں۔ پھر پشاور سٹیشن پر بطور پروڈیوسر راولپنڈی سٹیشن اور ریڈیو پاکستان اسلام میں سنئیر پروڈیوسر، پروگرام منیجر، ڈپٹی کنٹرولر اور پھر کنٹرولر کے عہدوں پر فائز رہیں اپنی 35 سالہ سروس میں ہمیشہ اچھا اور معیاری کام کیا۔ میزبان صدف رانی نے پھر آمنہ جبین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ان سے ان کی مہارتوں اور کارکردگی کے حوالے سے بات چیت کی آمنہ جبین نے بتایا کہ وہ ڈیجیٹل مارکیٹنگ میں اپنا نام بنا رہی ہیں اس کے علاوہ اس حوالے سے آرٹیکلز بھی لکھتی رہتی ہیں ان کا کہنا تھا کہ وہ چاہتی ہیں خواتین کو مالی لحاظ سے بااختیار ہونا چاہیئے اسی لئے وہ اان لائن جابز اور سکلز سکھا رہی ہیں جس میں ویب ڈویلپمنٹ اور گرافک ڈیزائننگ شامل ہیں اور فری لانسنگ کو پروموٹ کر رہی ہیں۔سٹوڈیو میں موجود کم عمر ڈیجیٹل مارکیٹر نے بتایا کہ وہ میڈیکل کی طالب علم تھیں لیکن ڈیجیٹل مارکیٹنگ کی دنیا میں ان کی دلچسپی پیدا ہوئی اور 16 سال کی عمر ڈیجیٹل مارکیٹنگ کی دنیا سے وابستہ ہیں اور دبئی میں اپنا بزنس بھی سیٹ کر چکی ہیں اور ڈیجیٹل مارکیٹنگ کے شعبہ میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر چکی ہیں اور خواتین کو مالی طور پر مستحکم کرنے پر کام کر رہی ہیں۔معصومہ زبیری جو کہ ایک فوٹو جرنلسٹ ہیں اور انٹرپرینیور ہیں انہوں نے بتایا کہ اگر والدین بچیوں کی صلاحیتوں کو جان لیں تو وہ کبھی بھی انہیں کچھ اچھا کرنے سے نہیں روکیں گے انہوں نے اپنے پروفیشن میں بہترین کام کیا ہے اور اقوام متحدہ کے ادارے سے اس سلسلے میں ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہیں۔اس کے علاوہ فوٹو جرنلزم پر ھا رہی ہیں۔انہوں نے بتایا کہ میری کمپنی سے جن لوگوں نے کام سیکھا ان میں سے 7 بیچز تو اپنی کمپنیز چلا رہی ہیں۔

اسٹوڈیوز میں موجود آمنہ خان نے بتایا کہ جب وہ یونیورسٹی سٹوڈنٹ تھیں تو پراجیکٹس پر کام کرنا ہوتا تھا جس میں وائس اوور کا کام بھی ہوتا تھا اور انہیں یہ کام بہت پسند تھا اسی مرحلے پر انہوں نے اپنے ٹیلنٹ کو ڈھونڈ لیا اور Fiverr اور upwork جیسے ان لائن جابز کے پلیٹ فارمز پر خدمات سرانجام دے رہی ہیں ان کا کہنا تھا کہ اس کام میں چیلنجز بھی بہت آئے لیکن وہ ہمیشہ ثابت قدم رہیں۔

میزبان صدف رانی نے ایک اور اہم شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ زونی اشفاق سابقہ ڈائریکٹر فیڈرل انویسٹیگیشن ایجنسی اور موجود ڈائریکٹر این ای سی ٹی اے ہیں انہوں نے سائبر کرائم اور سائبر بلنگ جیسے احساس نوعیت کے اداروں میں خدمات سرانجام دی۔

زونی اشفاق نے اپنے کامیابی کے سفر پر بات کرتے ہوئے کہا کہ فیملی میں اکثر لوگوں نے میری حوصلہ افزائی نہیں کی لیکن صرف ان کی والدہ نے انہیں سپورٹ کیا اور آج جہاں وہ کھڑی ہیں اس کا کریڈٹ وہ اپنی والدہ کو دیتی ہیں انہوں نے بتایا



کہ خواتین کو کچھ بھی اچھا کرنے کے لیے ہمیشہ خود کو خود مختار رکھنا چاہیے وہ ہمیشہ سے اسکالرشپ ہولڈر رہی ہیں۔

زونی اشفاق کا کہنا تھا کہ خواتین اس وقت سب سے زیادہ سائبر کرائم کا شکار ہو رہی ہیں اور اسی وجہ سے میں نے ایسے ادارے کا انتخاب کیا جہاں خواتین کے ایسے نمبھر مسائل کو سنا جا سکے اور حل کیا جا سکے کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ خواتین کے دکھ درد کو خواتین زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتی ہیں سوشل میڈیا کے استعمال پر ان کا کہنا تھا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ سوشل میڈیا محفوظ ہے اور اس میں کچھ بھی ڈیلیٹ کرنے سے ڈیلیٹ ہو جاتا ہے تو ایسا بالکل نہیں ہے لہذا سوشل میڈیا کے استعمال پر ہماری خواتین کو آگاہی دینے کی ضرورت ہے انہوں نے کہا کہ خواتین کو ان کے گھروں میں ہی اتنا تحفظ اور ان کی بات کو سنا جانا چاہیے تا کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے پورے خاندان کو مسائل کا شکار ہونا پڑے انہوں نے پیکا خواتین پر بھی ثابت کیزونی اشفاق نے کہا کہ خواتین میں کام کو ذوق وشوق سے کرنے کا جذبہ مرد حضرات سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے انہیں ہمیشہ مستقل مزاج رہنا چاہیے۔

اسٹوڈیوز میں موجود عبدحنا لودی اور زارا نور نے بھی مہمان خواتین سے گفتگو کی اور ان سے ان کی دلچسپیوں کے امور پر تبادلہ خیال کیا نیز ڈیجیٹل مارکیٹنگ کے حوالے سے سوالات بھی کیے۔

آرجے آمنہ ملک اور امشا باسط شیخ نے مہمان خواتین میں سے شاہدہ شعیب اور تینت مدبر سے ان کی کامیابی سے متعلق گفتگو کی میں سے شاہدہ شعیب جو کہ ہاؤس وائف ہیں اور بہت اچھی کک ہیں اس کے علاوہ بہت اچھی گلوکارہ بھی ہیں دوسری مہمان خواتین سمیت مدبر نے اپنے والد سے بات کرتے ہوئے کہا کہ وہ بے سہارا اور نادار بچوں کا ایک غیر منافع بخش ادارہ چلا رہی ہیں ان کی زندگی میں اس وقت ایک بہت بڑا موڑ آیا جس نے ان کی زندگی بدل دی ان کا کہنا تھا کہ ان کی شادی کم عمری میں ہو گئی شوہر کے ساتھ بہت خوشگوار زندگی گزار رہی تھی اچانک ایک دن ان کے روڈ ایکسیڈنٹ میں جان بحق ہونے کی اطلاع ملی انہوں نے اپنے دکھ کو بیان نہ کرنے کی ٹھانی اور اپنے جذبات وحسات پر قابو رکھتے ہوئے بے سہارا اور نادر بچوں کی کفالت کا بڑا بیڑا اٹھایا کیونکہ جب ان کے عزیز رشتہ داروں میں سے کچھ خواتین نے انہیں بے اولادی کا تھانہ دیا تو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا کہ انہوں نے بے آسرا بچوں کی کفالت کرنی ہے ان کا کہنا تھا کہ میرے والد نے ہمیشہ مجھے سپورٹ کیا اور بچپن سے ہی انہوں نے ہم بہن بھائیوں کو قائدانہ صلاحیتوں کا اجاگر کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کی ہے۔انہوں نے آخر میں پیغام دیتے ہوئے کہا کہ دکھ سکھ ہر انسان کے ساتھ ہیں لیکن خود سے پوچھیں کہ آپ معاشرے کو کیا دے رہے ہیں یا کیا دے سکتے ہیں؟

آرجے آمنہ ملک اور میشا نے خواتین کو مزید امید دلاتے ہوئے کہا کہ خواتین میں بہت صلاحیتیں ہیں وہ گھر کے ساتھ ساتھ باہر کی دنیا میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں اور یہ سب مرد حضرات کی سپورٹ سے ممکن ہے آرجے ایشان نے آرجے آمنہ ملک سے سوال کیا کہ اج اپ بھی اپنی کامیابی کا سفر ہمیں بتائیں تو آمنہ ملک نے جواب میں بتایا کہ میں میڈیکل سٹوڈنٹ تھی لیکن یہاں ایڈمیشن ہوا وہاں جانا نہیں چاہتی تھی تو میں نے سائیکالوجی کی فیلڈ اختیار کی میں ایک سائیکالوجسٹ ہوں اس کے علاوہ سپیچ اور لینگویج پیتھالوجسٹ بھی ہوں ریڈیو پر بولنے کا شوق بچپن سے تھا پروگرام بہت دلچسپی اور جرات سے سنتی تھی اور یہی شوق مجھے ریڈیو لے آیا۔

FM-101 ٹیم نے اپنے پروگرام میں خواتین کے عالمی دن کے موقع پر دنیا کو یہی پیغام دیا گیا کہ خواتین صلاحیتوں کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں معاشرے میں وہ عزت اور وہ مقام دیا جائے جس کی وہ حقدار ہیں کیونکہ ایک خاتون بیک وقت ایک ہاؤس وائف ہے ماں ہے بیٹی ہے بہن ہے اور ایک پروفیشنل ورکنگ وومن ہے اور سب سے بڑھ کر عورتوں کے مسائل کے حل کے لیے بہترین ہستی ہے اس سال کی تھیم "مساوات" سے مراد یہی ہے کہ جہاں مرد حضرات کی حاکمیت ہے وہیں عورت اس حاکمیت کی بقا کی ضامن ہے۔

**موقع پر قازقستانی سفارت خانے کی سیکریٹری (تھری) کی ریڈیو پاکستان میں آمد اور نوروز کے موقع پر خصوصی پیغام**

(رپورٹ) کامران طارق

دنیا بھر کے مختلف حصوں میں موسم بہار اور نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے ''نوروز'' کا جشن منایا جاتا ہے۔''نوروز'' فارسی زبان کا لفظ ہے جس کی لغوی معنی ''نیا دن'' ہے۔نوروز کا تہوار عموماً 19 سے 21 مارچ کے درمیان ہوتا ہے جسے ایران اور فارسی بولنے والے ممالک جوش وخروش سے مناتے ہیں۔نوروز ایرانی کیلنڈر کے نئے سال کا پہلا روز ہوتا ہے جسے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایران سمیت مختلف ممالک میں پرمسرت تقریبات کا انعقاد سے کیا جاتا ہے۔نوروز کا شمار دنیا کے قدیم ترین تہواروں میں ہوتا ہے۔بعض مورخین کے مطابق ''نوروز'' کا تہوار تین ہزار سال سے منایا جارہا ہے۔اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فروری 2010ء میں نوروز کو عالمی دن کے طور پر منانے کی منظوری دی تھی۔

پاکستان میں نوروز کے پروگرام، بہار کے آغاز کے ساتھ ہی بلوچستان کے کوئٹہ،جعفر آباد،مکران اور گوادر میں،گلگت بلتستان کے گلگت،اسکردو،ہنزہ،استور میں، صوبہ خیبر پختون خواہ کے پشاور،سوات،بنوں اور دیگر قبائلی علاقوں میں اور اس طرح پنجاب کے مختلف شہروں میں منعقد کیے جاتے ہیں۔پاکستان میں زرتشی دین کے ماننے والوں کی اکثریت کراچی میں رہتی ہے جبکہ افغان پناہ گزرینوں کی بڑی تعداد شمال جنوبی علاقوں میں رہتی ہے اور یہ لوگ خاص طور پر بڑے جوش وخروش سے نوروز مناتے ہیں۔پاکستان کے ساتھ ساتھ نوروز ایران اور افغانستان کے علاوہ پاکستان،عراق،ترکی،آزربائیجان،تاجکستان،ازبکستان،کرغزستان اور قازقستان سمیت دیگر ممالک میں بھی منایا جاتا ہے۔پاکستان کی خارجہ پالیسی کی مضبوطی کی ضمانت دیتے غیر ممالک سے آئے سفارتی عہدے دار بھی نوروز کے موقع پر خصوصی تقریبات منعقد کرتے ہیں۔نوروز کے تہوار کی مناسبت پاکستان میں موجود قازقستان ایمبیسی کی سیکریٹری تھری ژالہ کاریکودہ نے ریڈیو پاکستان کے پلیٹ فارم سے سامعین کے لیے خصوصی پیغام ریکارڈ کروایا جس کا اردو ترجمہ کچھ یوں ہے۔

''نوریز مبارک ہو!

ریڈیو پاکستان کے تمام سامعین کو برکتوں اور خوشحالی بھرا اور ہم آہنگ بناتا خوشی کا یہ جشن مبارک ہو۔نئے سال کی آمد کا پتہ دیتا نوروز قازقستانی قوم کے لیے ایک اہم تہوار ہے۔21 مارچ سے شروع ہونے والا یہ قدیم تہوار کئی دنوں تک پاکستان سمیت وسطی ایشیا،ایران سمیت مختلف ممالک میں منایا جاتا ہے جو زندگی کے نئے مرحلے،نیکیوں کا سکون اور محبت کے اثاثے کی علامت بھی ہے اور ماضی کی کوتاہیوں کو بھلا دینے کا نام بھی۔اس موقع پر ہر کوئی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کا عہد کرتا ہے۔یہ تہوار مناتے ہوئے روایتی خانہ بدوش گھروں کی تعمیر کے ساتھ پرتکلف کھانوں کے اہتمام کے مراکز قائم کیے جاتے ہیں جبکہ شہر کے مرکزی چوکوں پر خصوصی محفلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے



جہاں قازقستان کی موسیقی سننے،آلات بجانے کے ساتھ ساتھ خوبصورت لباس میں ملبوس خانہ بدوشوں کے طرزِ رہن سہن کے بارے میں جانکاری حاصل کی جاسکتی ہے۔ہم اُمید کرتے ہیں نوریز سب کے لیے خوشیوں اور کامیابیوں سے بھرے سال کا آغاز ہو۔

ایک بار پھر سے آپ تمام کو نوروز مبارک!''

تہواروں کی شروعات جس نے جب بھی کی ہو ان میں انسانی،سماجی ومعاشی مثبت رویوں کا پہلو نمایاں رہا ہے۔تہواروں سے آپسی محبت،میل ملاپ،رواداری اور تعلقات میں اضافہ تو ہوتا ہی ہے سماجی بندھن بھی مضبوط ہوتے ہیں۔انسان کمزوروں،مجبوروں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کے لئے آگے بڑھتا ہے۔یوں انسان دوستی،میل ملاپ،اتحاد واتفاق،اخوت و بھائی چارے کے جذبات بھی پروان چڑھتے ہیں۔پاکستان میں موجود قازقستان ایمبیسی کی سیکریٹری تھری ژالہ کاریکودہ کی آمد پر یہ خصوصی پیغام اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان اسلام آباد سید فخر عباس شاہ اور ڈپٹی کنٹرولر حامد ظہور کی زیرنگرانی پروگرام منیجر محمد امین بنگش اور سینئر پروڈیوسر کامران طارق نے ریکارڈ کیا

☆☆☆

# استاد بڑے غلام علی خان

ممتاز موسیقار

استاد بڑے غلام علی خان 12 اپریل 1902 میں قصور میں علی بخش کے ہاں پیدا ہوئے۔ان کے والد علی بخش خان بہت اچھے گائیک تھے۔استاد بڑے غلام علی خان نے کلاسیکی موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد اور بعد میں اپنے چچا کالے خان سے حاصل کی، کالے خان پٹیالہ گھرانے کے عظیم کلاسیکل گائیک کرنل صاحب فتح علی کان کے شاگرد تھے،اس لیئے استاد بڑے غلام علی خان نے پٹیالہ گائیکی کے رنگ کو اپنایا۔

پٹیالہ گائیکی میں زوردار تان گمک کے استعمال اور فنی کمالات پر بہت زور دیا جاتا ہے لیکن کالے خان صاحب نے صرف پٹیالہ گائیکی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خیال گائیکی میں بھی جذبے اور شیرینی کو شامل کر کے نئی افتراع کی تا کہ صرف ٹیکنیک کی باریکیوں ہی کو فن کا اصل نہ بنایا جائے بلکہ مٹھاس پیدا کر کے سامعین کو سنایا جائے۔جنوبی ایشیاء میں کلاسیکی موسیقی پر استاد بڑے غلام علی خان کا خاصا اثر ہے۔استاد بڑے غلام علی کان گائیکی، ترانہ، ٹھمری میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے دو چھوٹے بھائی استاد برکت علی خان اور استاد مبارک علی خان پاکستان ہی میں رہ گئے۔استاد بڑے غلام علی خان کے صاحبزادے استاد منور علی خان نے بھی بڑا نام کمایا اور ان کے دوسرے بیٹے کرامت علی خان نے اپنے والد کے فن گائیکی کو نہیں اپنایا۔

استاد بڑے غلام علی خان پیدائشی گائیک تھے۔ان کی نس نس میں سُر بسا ہوا تھا اس پر استاد کالے خان جیسے بے مثال گائیک بطور استاد مل گئے۔انہوں نے کم عمری میں سارنگی بھی بجائی اور اپنے وقت کی مشہور مغنیہ عنایت بھائی ڈھیروں والی کے ساتھ کچھ عرصہ سنگت کی۔بچپن میں والد کے انتقال کے بعد انہوں نے حصول رزق کے لئے بڑی محنت کی مگر جلد ہی سارنگی چھوڑ کر انہوں نے راگ داری میں کمال حاصل کیا استاد بڑے غلام علی خان نے لاہور ریڈیو سے راگوں کے علاوہ ٹھمری، دادرا حتیٰ کہ عارفانہ کلام کو بھی گایا جس میں خواجہ غلام فرید، بابا بھلے شاہ اور شاہ عبداللطیف کا خیال قابل ذکر ہے۔

استاد بڑے غلام علی خان نے بے شمار اعزازات حاصل کئے اور دنیا کے اہم ترین ملکوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا انہیں موسیقی کی دنیا کا دیوتا کہا جاتا ہے۔ان کے مداحوں میں نامور موسیقار خواجہ خورشید انور، فیروز نظامی، نور جہاں، لتا منگیشکر اور دوسرے عظیم لوگوں میں فیض احمد فیض، قراۃ العین حیدر شامل ہیں۔استاد بڑے غلام علی خان جیسے فنکار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں انہیں قدرت نے سریلی شریں آواز کو روح کی تسکین کا ذریعہ بنانے پر دسترس عطا کی۔استاد بڑے غلام علیخان نے ادائل عمری سے لے کر حیات کے آخری لمحے تک ریاض نہیں چھوڑا وہ آواز کی باریکیوں سے لفظ کے تاثر کو یوں ابھارتے کہ اس کی چوڑی شکل سامنے آجاتی تھی۔ پھر یہ بھی کہ راگ استاد بڑے غلام علی خان کی روح میں رچے بسے تھے۔وہ الاپ سے لے کر دُرت تک کمال فن کو ہزار روپ میں پیش کرنے پر قادر تھے۔

استاد بڑے غلام علی کی سرگم پر قدرت بے نظیر ہے۔اس سلسلے میں ہزاروں مثالیں ان کی گائیکی سے دی جاسکتی ہیں کیونکہ راگ اور استاد بڑے غلام علی ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔اس لئے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی قدر کے اس عظیم اور انمول گائیک کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔بڑے غلام علی خان پر 1961 میں فالج کا حملہ اس وقت ہوا جب وہ دہلی کے ایک کنسرٹ ہال میں اپنے فن کا مظاہر کرتو چکے تھے۔بہترین علاج کے بعد بڑے غلام علی خان صاحب نے راگ و دیا جاری رکھا۔33 اپریل 1968 کو حیدر آباد دکن میں وفات پائی اور یوں استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے رخصت ہوجانے سے کلاسیکل گائیکی کے ایک سنہرے دور کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔





# استاد نتھو خان

## سارنگی نواز

استاد نتھو خان سارنگی نواز دنیائے موسیقی میں ایک قد آور شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا نعیم البدل پاکستان کی تاریخ میں آج تک نہیں مل سکا۔سارنگی ایک ایسا ساز ہے۔تانت کے تاروں پر ناخنوں سے بجایا جانے والا یہ ساز بہت مشکل اور محنت طلب ہے۔استاد نتھو خان کو سانگی کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ان کی انگلیوں میں وہ تاثیر تھی جو تانت کے تاروں کو چھیڑتی تو ایک سماں بندھ جاتا کہ جس کا کوئی مقابلہ نہ تھا اور نہ آج تک ہے۔

سارنگی برصغیر پاک و ہند میں بجایا جانے والا ایک ساز ہے جس کا موجد اور جائے بناوٹ آج تک وثوق سے نہیں بتائی جاسکی۔سارنگی تار سے سازوں میں گز (BOW) سے بجایا جانے والا یہ ساز موسیقی کا اہم ساز ہے۔پاکستان میں اس ساز کو لاہور قصور اور ہندوستان میں کیرالہ، بنارس، پانی پت، سونی پت اور جھجھر کے سارنگی نوازوں نے بام عروج تک پہنچایا۔

سارنگی کی کئی اقسام ہیں۔تنہا بجانے یا سنگیت والی سارنگی ہی مکمل سارنگی کہلاتی ہے۔یہ جسامت میں دیگر سارنگی سے بڑی ہوتی ہے۔چھوٹی سارنگی، ڈھڈ بجانے والوں کے لئے ہے۔

استاد نتھو خان بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔تنہا سارنگی نوازی میں تو یکتا تھے یہی سنگت کرنے میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔پاکستان کے نامی گرامی موسیقی گلوکاروں نے بھی ان کی سنگت کا اعتراف کیا ہے۔استاد نتھو خان نے بیرون ملک روس، امریکہ، چین، بنگلہ دیشن اور افغانستان میں اپنے فنی مظاہروں سے خواص و عام کے دل جیتے اور پاکستان کا نام سربلند کیا۔

استاد نتھو خان اپنے فن میں انفرادی اہمیت کے حامل تھے، اور بے انتہا کمال کے فنکار تھے۔ماہر موسیقی اور بہترین عامل تھے۔کسی دوسرے رنگ نواز کا ان کے ہوتے ہوئے چراغ نہ جل سکا۔بڑے بڑے سارنگی نواز ان سے مقابلے میں کتراتے تھے۔استاد نتھو خان نے بڑے مشکل اور اچھوتے راگ سارنگی پر بڑے سہل انداز میں پیش کئے۔ان کی علمی حیثیت کا اندازہ ان کے لانگ پلے (LP) ریکارڈوں یا ریڈیو پاکستان کے آواز خزانہ میں ان کی وسیع ریکارڈنگ کی موجودگی سے کیا جاسکتا ہے۔

استاد نتھو خان 17 اپریل 1971 میں وفات پا گئے اور کراچی میں انہیں دفن کیا گیا ان کے فرزند مجاہد حسین پاکستان کے صف اول کے موسیقار ہیں اور حکومت پاکستان نے انہیں تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔استاد نتھو خان کا اثاثہ ان کی ریڈیو ریکارڈنگ ہے اور جب تک آواز کی دنیا قائم ہے اس اثاثہ سے آنے والے سارنگی نواز استفادہ کرتے رہیں گے۔

داغ دل ہم کو یاد آنے لگے
لوگ اپنے دیئے جلانے لگے

# اقبال بانو۔۔دنیائے موسیقی کی ملکہ

پاکستان کی مٹی سرسنگیت کے حوالے سے ہمیشہ سرخیل رہی ہے۔یہاں پیدا ہونے والے ہر گلوکار ،موسیقار نا پنے اچھوتے نشان چھوڑے ہیں اور موسیقی ،گلوکاری کا ایسا ترتیب دیا کہ آج بھی سننے والے کو تخیل گہرائیوں میں لے ڈوبتا ہے۔ایسی ہی ایک عہد ساز نامور گلوکارہ اقبال بانو ہیں جو اپنی زندگی کے ہر دور میں مقبول رہیں۔روائتی غزل ہو, فیض احمد فیض کا کلام ہو اور یا نظم مداح آج بھی اقبال بانو کی آواز سن کر سر دھنتے ہیں۔اقبال بانو کی آواز کے زیر و بم میں حسن جیسی ملائمت ،عشق جیسی تمکنت اور محبت جیسی والہانہ گرمجوشی ملتی ہے جو دل کے نازک تاروں کو چھیڑتی ہے جیسے خوشبو کا ر ئی جھونکا ہو یا بہار کی صبح کا احساس جس سے پورا وجـ مہک اٹھے۔یہ آواز رنگ و روشنی کا وش سرور ہے جس سے ہر کوئی جی اٹھے۔یہ آواز اقبال بانو کی آواز ہے،جن کے گائے ہوئے گیت اور غزلیں دنیائے موسیقی میں ایک ا ـشان، مقام اور پہچان رکھتی ہیں۔وقت نے ان کی تابنـ کو کبھی ماند نہیں پڑنے دیا۔بلکہ اس کو کچھ اور نکھار دیا۔اقبا بانو گائیکی کے پہلے دن کے آغاز ہی سے ہر کنسرٹ میں اکھوں لوگوں کی داد سمیٹتی رہی ہیں۔ان کی آواز پر مر مٹنے وا ـلے ملک اور ملک سے باہر یکساں طور پر موجود ہیں اور اقبال بانو کی آواز میں گائی غزلوں کے دیوانے۔

اقبال بانو نے اور جن شاعروں کے کلام اپنی گائیکی سے رواج بخشا ان میں مرزا غالب، داغ رہوں، حفیظ ہوشیار پوری، خلیل شفائی، احمد فراز اور منیر نیازی کے نام سہر فرہست ہیں۔اقبال بانو غزلوں کے علاوہ نظموں کی گائیکی میں بھی انفرادی حیثیت رکھتی تھیں۔خصوصاً فیض احمد فیض کی نظموں کی دشت تنہائی میں اور میرے دل میرے مسافر، کب ٹھہرے گا در داور لازم ہیں کہ ہم بھی دیکھیں گے۔انہوں نے جس کمال انداز سے گایا وہ انہیں کا حصہ ہیں۔ فارسی غزلیں بھی گائیں جو ایران اور افغانستان میں بہت مقبول ہوئیں اور انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے 1974 میں صدارتی تمغہ حسن کی کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔

اقبال بانو 21 اپریل 2009 کو مختصر علالت کے بعد لاہور میں انتقال کر گئیں۔

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے





مشاعر: فاروق ملانہ سیال

گاوامن کے سارے گیت
ڈالو دیس میں پیار کی ریت
بن جاو تم سارے میت
دشمن پر تب ہو گی جیت
امن کا سب پرچار کرو
اک دوجے سے پیار کرو
آپس کے سب جھگڑے چھوڑو
ہر تعصب کا بت توڑ
وبھائی کو بھائی سے جوڑو
رخ اپنا اس جانب موڑو
دور رہے گا ہر آزار
قوم کا ہو گا بیڑہ پار
دین نبی کے ہم ہیں سپاہی
حق کی دیں ہم سدا گواہی
ہر جا ہو گی پھر اپنی شاہی
سمجھے گر نہ ہو گی تباہی
آو بنیں ہم خلق کے خادم
گر ہو غلطی تو ہو جائیں نادم

# احمد رشدی

پروین شاکر

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے اسٹوڈیو میں وہ شخصیت موجود ہے جس کی آواز ہرات اور ہر موسم کی آواز ہے۔ وہ چاہے شام کا ڈھلتا ہوا دن ہو یا چمکتی ہوئی صبح ہنستی ہوئی بہار ہو یا اپنی تنہائی میں گم خزاں۔ مشرق کی دھیمی پرسوز اور اداس موسیقی ہو یا مغرب کی تیز جگمگاتی دھنیں۔ ہر لہجے کو اپنی گرفت میں لینے والی اس آواز کا نام احمد رشدی ہے۔ ہم جب چھوٹے چھوٹے ہوا کرتے تھے تو اس آواز کو سن کر بندر روڈ سے کیماڑی کی سیر کیا کرتے تھے۔ لیکن اب کراچی کی وسعت بھی بندر روڈ سے کیماڑی تک نہیں رہی اور اس گیت کو گانے والا بھی ایک ملک گیر آواز بن چکا ہے۔

س: احمد رشدی صاحب سب سے پہلے آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گی کہ جس گیت کی طرف میں نے اشارہ کیا وہاں سے لے کر آج تک آپ نے جو سفر طے کیا ہے، اس سفر کو طے کرتے ہوئے آپ کو کیا شروع سے ہی حوصلہ افزائی ملتی رہی یا آپ نے بڑی ہمت سے ان مشکلات کا مقابلہ کیا ہے اور اس راستے کو طے کیا ہے؟

ج: ہاں ہاں ظاہر ہے کسی منزل کو پانے کے لئے آدمی کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ کٹھن مراحل میری زندگی میں بھی آئے ہیں۔ سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتادوں کہ مجھے گانے کا اتنا زیادہ شوق نہیں تھا۔ بلکہ زیادہ تر اداکاری کا شوق تھا مگر یہ ایک حادثہ سمجھے گا کہ میں اس شعبے میں آ گیا۔ گلوکاری کے شعبے میں آپ کی حادثاتی آمد تو بڑی خوشگوار تھی کہ اس کے بعد پاکستان کو ایک ایسی آواز مل گئی کہ وہ بجا طور پر فخر کر سکے۔

ج: چونکہ مجھے گانے کا شوق نہیں تھا ویسے غیر دانستہ طور پر کبھی کبھی گنگنا لیتے تھے۔ کبھی اسکول کے پروگرام میں کسی کنسرٹ میں حصہ لے لیا کہ بتا تھا تو لوگوں کا خیال تھا کہ میری آواز اچھی ہے لیکن میں نے کبھی اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن پھر ایک دن میں نے ریڈیو پاکستان میں آڈیشن دیا۔

س: یہ آڈیشن کا خیال آپ کو کس نے دلایا؟

ج: میرے ایک دوست تھے ریڈیو پاکستان میں انہوں نے مجھے اس طرف متوجہ کیا۔ اس زمانے میں یہاں بہت عجیب وغریب قسم کے گیت گائے جاتے تھے پرانے اسٹائل کے۔

س: میرا خیال ہے کہ اب وہ گیت عجیب وغریب نہیں رہے۔

ج: اور ہوسکتا ہے یہ گیت جواب سُنے جاتے ہیں آئندہ پچیس سال کے بعد عجیب وغریب لگیں۔ میرا مقصد یہاں کسی کی تضحیک نہیں میں تو آڈیشن کا ذکر کر رہا تھا۔ میرے دوست نے مجھ سے کہا کہ تم اپنی آواز کا ٹیسٹ دو اور مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ میں یہاں آیا جسے تفریح کہنا چاہئے، اور میں نے آڈیشن دیا اور پھر آڈیشن کے بعد میرے دوست نے کہا آپ کا پروگرام آج ہی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ میں اس قابل ہوں کہ میں ریڈیو سے گا سکتا ہوں۔ اس زمانے میں ایک پروگرام ہوتا تھا نئی آواز اس کے پروڈیوسر شریف عنایت اللہ تھے۔ میرا آڈیشن بھی انہوں نے ہی لیا اور پروگرام بھی انہوں نے ہی دیا۔ اس پروگرام میں میں نے غالب کی ایک غزل گائی جس کی کمپوزیشن بھی انہوں نے ہی کی تھی۔ یہ غزل میں۔ گائی تو لوگوں نے کہا کہ بہت اچھی آواز ہے اور ہر طرف سے مجھے مبارک ملی۔ اس پر میں نے یہ محسوس کیا کہ شاید مجھے میں کچھ جوہر ہیں اور میں تھوڑا اس طرف سے سنجیدہ ہوا۔

س: رشدی صاحب جب آپ نے خود گیت سُنا تو آپ کو کیسا لگا؟۔۔۔۔۔۔۔۔

بہت اچھا لگا فلمی دنیا میں متعارف ہوا اور قدرت کی طرف سے یہ بڑی مہربانی رہی کہ پہلے ہی ہفتے میں مجھے فلم میں گانے کا چانس ملا۔

س: اچھا یعنی براہ راست آپ ریڈیو سے فلم میں منتقل ہو گئے جس کے لیے کسی عام گلوکار کو برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔

ج: مگر اس کے باوجود جو عرصہ تھا پانچ چھ سال کا اس میں بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔

س: کیا آپ کو فلم کے ماحول سے مطابقت اختیار کرنے میں مشکل پیش آئی؟

ج: ظاہر ہے جب آدمی کسی لائن میں جاتا ہے چاہے وہ موسیقی کی ہو چاہے وہ اداکاری کی ہو اس کو اپنا مقام بنانے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور اس عروج پر پہنچنے کے لیے کافی دشواریاں ہوتی ہیں۔

س: احمد رشدی صاحب ایک عام تاثر پاکستان کی فلمی صنعت کے بارے میں یہ ہے کہ یہاں سٹار سسٹم ہے یہاں گروپ بنے ہوئے ہیں اگر ایک گروپ کا آدمی ہے تو دوسرا گروپ اسے ہرگز قبول نہیں کرے گا اور اسے چانس نہیں دے گا کیا آپ کو اس مشکل کا سامنا ہوا؟

ج: میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ مجھے ایک مخصوص قسم کا گلوکار بنا دیا گیا تھا اور میں نے ایک ہی طرح کے گانے گایا کرتا تھا یعنی مزاحیہ قسم کے گانے۔

س: بڑے عرصے تک آپ یہ ایک خاص قسم کی چھاپ تھی۔

ج: اس شعبے میں کوئی اور گلوکار نہیں تھا اس وجہ سے میری زیادہ مخالفت نہیں ہوئی۔

س: لیکن آپ نے سنجیدہ گانے بھی گائے مثلاً کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو۔

ج: اس کے بعد جب میں نے سنجیدہ گانے گائے تو تھوڑی سی مخالفتیں بنی مگر یہ سمجھئے گا کہ کچھ مجھ میں تھا جو لوگ ذرا مجھ سے پیچھے ہٹے۔

س: وہ دور جس میں آپ نے مزاحیہ گانے گائے وہ آپ پر جبر تھا یا اختیار؟

ج: جبر کہیے گا اسے چونکہ میں کوئی ٹائپ بنانا نہیں چاہتا تھا میں بنیادی طور پر اداکار بننا چاہتا تھا اداکار یعنی ہیرو نہیں بلکہ کریکٹر ایکٹنگ کی طرف میرا زیادہ تر ذوق تھا۔

س: رشدی صاحب آپ یہ کہتے ہیں کہ جو مزاحیہ دور تھا وہ آپ کی مجبوری تھی اور آپ کو دل سے پسند نہیں تھا یعنی آپ مجبور تھے لیکن کیا وجہ ہے کہ آج کل جب آپ کا کوئی اسٹیج پر آرام 21 ان پروگرام ہو تو عموماً لوگوں کی یا تو فرمائش ہوتی ہے یا آپ خود ہو ہی مشہور پاپ میوزک کے گانے سناتے ہیں بجائے کسی سنجیدہ گانے کے۔ اس کی کیا وجہ ہے یا پبلک کے کہنے پر ہے۔ جواب نہیں۔ یہ تو پبلک کے کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے آپ نے ٹیلی ویژن پر دیکھا ہے کہ وہاں پاپ میوزک کے جو پروگرام ہوتے ہیں اس میں ظاہر ہے کہ اگر وہ مجھے بلائیں گے تو میں اسی قسم کے گانے گاوں گا جس طرح سے وہ مجھے کہیں گے۔ اور میں یہ خود ہی نہیں چاہتا، پوپ میوزک مجھے خود بھی پسند نہیں ہے مگر یہ کہ ٹیلیویژن کے جو پروگرام ہوتے ہیں اس میں پوپ میوزک ہوگا۔

س: اسٹیج پر بھی کیا ہی پابندیاں ہوتی ہیں؟

ج: اسٹیج پر آپ دیکھئے کہ وہ مجھے ہلائیں گے تو میں ہر قسم کے گانے گاؤں گا لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ میں کبھی ٹائپ نہیں بنایا۔

س: تو یہ کہا جائے کہ پوپ موسیقی کا سرچشمہ جو کہ مغربی موسیقی ہے آپ کی روح کو سکون نہیں دیتی کیونکہ آپ کو وہی اپنی پرانی مشرقی دھنیں یعنی کلاسیکل پسند ہیں۔

ج: ظاہر ہے کہ مشرقی موسیقی میں جو لذت اور نفس کی ہے وہ میرے خیال میں پوپ میوزک میں نہیں ہے۔

س: اس وقت آپ کس کو سمجھتے ہیں کہ کون ایسا فنکار ہے جو صحیح طور پر تربیت یافتہ ہے کلاسیکل موسیقی میں۔

ج: میرے خیال میں، میری اپنی پسند میں مہدی حسن جیسا گلوکار نہ تو پاکستان میں، بلکہ برصغیر میں نہیں ہے۔ ایسا منجھا ہوا، اتنا سُریلا اور غزل کی گائیکی میں کوئی ایسا فنکار شاید برسوں بعد پیدا ہو۔

س: ان کی آواز ان کی گائیکی پر اعتماد ایسا ہے کہ جسے آپ منفرد اور یکتا کہہ سکتے ہیں۔ رشدی صاحب آپ کے اس طرح کے گانے اتنے کم کیوں ہیں؟

ج: آپ نے بڑا اچھا سوال کیا ہے۔ آپ نے آج سے سات آٹھ سال یا آج سے دس سال پہلے میرے ایسے گانے سنے ہوں گے المیہ گانے جو میں نے ارمان، دوراہا، شہنائی، انجمن اور اسی طرح کی بہت سی فلموں کے لئے گائے۔ المیہ گیت جسے کہنا چاہئے وہ میں نے گائے۔ تو یہ میرا قصور نہیں ہے اس لئے کہ میں سنجیدہ گانے خود نہیں گا سکتا، کمپوزر مجھے گانے کا موقع دے گا تو میں گاؤں گا۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک فنکار مہدی حسن ہے، ظاہر ہے ان سے کمپوزر سنجیدہ گانے کرواتے رہے۔ انہوں نے کوشش ہی نہیں کی کہ رشتے بھی یہ گانے گا سکتا ہے اگر وہ مجھے کہیں گے تو میں کہوں گا وہ سنجیدہ گیت ہو میں پہلے گا چکا ہوں لوگوں کو اگر میرے گیت پسند ہیں تو اب بھی اس قسم کے گیت مجھے مل جائیں تو میں گاتا رہوں گا۔

س: موسیقی کے حوالے سے کیا کہیں گے، اور اپنے معاہدے کے حوالے سے بتائیں؟

ج: نہیں پیشہ وارانہ طور پر کہوں گا کہ کلاسیکل موسیقی اور ہلکی پھلکی موسیقی دونوں مختلف چیزیں ہیں دیانت کا جہاں تک تعلق ہے تو پہلے یہ ہوا کرتا تھا کہ ایک ایک گانے کی ساتھ ساتھ دن ریہرسل ہوا کرتی تھی اور اب صرف ایک گھنٹہ پہلے ریہرسل ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ جہاں تک معاہدے کا تعلق ہے اگر کوئی میرے پاس آتا ہے تو میں اسے منع نہیں کر سکتا۔

س: کیا آپ کا ضمیر اس وقت مطمئن ہوتا ہے؟

ج: ظاہر ہے کہ مطمئن تو نہیں ہوتے اور جو نتیجہ ملنا چاہیے وہ نہیں ہوتا اور بعد میں بہت سی چیزیں سامنے آتی ہیں کہ کاش اس گانے میں یہاں پر یہ تاثر ہوتا پہلے یہ ہوتا تھا کہ سات آٹھ دن تک ایک ہی گانا چلتا رہتا تھا یعنی مشین کی طرح لیکن اب ایسا نہیں ہوتا۔

س: بالکل اسی طرح جیسے ایک اداکار ہے، بہت مصروف ہے ایک جگہ ہیرو کا کردار کر رہا ہے دوسری جگہ اداس ہے تیسری جگہ ہنس رہا ہے۔

ج: یہ بددیانتی تو بالکل ہے۔

س: اس کے تدارک کا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ آپ کم معاہدے کریں۔

ج: اس کے تدارک کا طریقہ یہ ہے کہ نئے فنکار آنے چاہیے کوئی اکیڈمی ایسی ہونی چاہیے میوزک کی اداکاری کی اور دوسرے فنون لطیفہ کی۔

س: یعنی کوئی باقاعدہ تربیت گاہ ہونی چاہیے۔

ج: جی ہاں کوئی باقاعدہ تربیت گاہ ہونی چاہیے یعنی نئے فنکار آنے چاہیے۔

# ادب بچوں کا



تحریر و تحقیق: افشاں نگار

پاکستان بننے کے بعد مسائل زیست کے ہنگاموں اور معاش و اقتصاد کے فوری تقاضوں کی وجہ سے کتابوں کی رفتار اشاعت بہت کم تھی، قدرتی طور پر بچوں کے لیے کتابوں کی تالیف و اشاعت بھی محدود تھی لیکن سیاسی عدم استحکام کے باوجود معاشرتی استحکام اور صنعتی و تجارتی سرگرمیوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی مشاغل میں بھی اضافہ ہوا۔ سرکاری اور نجی اداروں کے قیام، تعلیمی اداروں کے پھیلاؤ اور نصابی ضروریات میں وسعت کے نتیجے میں تحقیق و تالیف اور اشاعت کتب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اس کے زیر اثر بچوں کی کتابوں اور رسالوں کی اشاعت میں بھی اضافہ ہوا۔ پاکستان کی پہلی دہائی میں بچوں کے گنتی کے چند رسالے شائع ہوتے تھے، آج ان کی تعداد کم و بیش چالیس ہوگی۔ یہ تعداد بھی قابل رشک تو کیا کافی بھی نہیں ہے تاہم اسے حوصلہ افزا کہا جا سکتا ہے۔

بچوں کے لیے لکھنے کے اپنے تقاضے ہیں، اس میں موضوع کی جتنی اہمیت ہے، اتنی ہی اہمیت ابلاغ کی ہے نہ صرف زبان صحیح، سلیس اور سادہ ہو بلکہ مجموعی طور پر انداز بیان واضح قابل فہم اور دلکش ہو۔ اس کی اہمیت مولانا محمد حسین آزاد کے اس بیان سے واضح ہوتی ہے: جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ انہیں بار بار کاٹنا اور بنانا لکھنا اور مٹانا بڑا ہو کر بچہ بنا پھرتے چلتے سوتے جاگتے، بچوں ہی کے خیالات میں رہتا۔ مہینوں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔

" کھلونوں سے مراد بچوں کی کتابیں ہیں جو مولانا آزاد نے سال ہا سال کی محنت اور غور و فکر کے بعد لکھی تھیں۔ مولانا آزاد جیسے فاضل ادیب نے بچوں کے لیے لکھتے وقت یہ نہیں سوچا کہ اس سیان کو کیا ملے گا اور ایک ایسی مثال قائم کی جس کو آج بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

مولانا محمد حسین آزاد کے بعد جس شخصیت نے بچوں کے ادب کے لیے ہم کام کیا اور طویل غور و فکر کے بعد بچوں کی نفسیات اور ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ان کے لیے مختلف سطحوں کی کتابیں لکھیں۔ وہ ہیں مولانا اسماعیل میرٹھی۔ ان کا اردو قاعدہ اور پہلی سے آٹھویں تک کتابیں، ان کی مہارت، تجربے اور دماغ سوزی کا ثبوت ہیں اور تقریباً نصف صدی تک ان سے کئی نسلوں نے فائدہ اٹھایا۔

بچوں کے لیے لکھنے والے ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں سے بعض کی تحریریں آزادی سے پہلے کی ہونے کے باوجود پاکستان کی نئی نسل کو بھی میراب کرتی ہیں اور کچھ تو آج بھی زندگی کا ثبوت دے رہی ہیں۔ اقبال 'اختر شیرانی، حفیظ جالندھری امتیاز علی تاج' صوفی تبسم الیاس احمد مجیب عبد الواحد سندھی، کوثر چاند پوری حامد اللہ افسر اشرف صبوحی اور متعدد نام بچوں کے ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، انہیں نہ صرف اس دور میں پڑھا گیا بلکہ آج کے بچوں کے لیے لکھنے والوں نے بھی پڑھا اور متاثر ہوئے اور آج بھی ان سے استفادہ جاری ہے۔

حفیظ جالندھری نے بچوں کے ادب کے لیے بھی خاصا کام کیا۔ پھول کی ادارت کے علاوہ بچوں کے لیے خود بھی نظمیں لکھیں اور نثر میں بھی کام کیا۔

کرشن چندر اگرچہ ہندوستان میں رہے لیکن ان کی بعض تحریریں صرف پاکستان میں چھپیں۔ 1959ء میں "چالاک خرگوش" کے نام سے ایک قسط دار کہانی لکھی جو سال بھر تک ہمدرد نونہال کراچی میں چھپتی رہی اور پھر انہی سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔ کرشن چندر کی زبان میں جو شاعرانہ بہاؤ ہے، وہ بچوں کے لیے ان کی تحریریوں میں بھی ہے۔ انہوں نے عالمی ادب سے استفادہ کر کے اپنے مخصوص اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے بچوں کے لیے اردو ادب میں اضافے کیے۔

مسلم ضیائی غالب شناس بلکہ غالب پرست تھے لیکن بچوں کی فلاح و بہبود کو ان کی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ 1944ء میں انہوں نے حیدر آباد سے بچوں کا ایک رسالہ " تارے " نکالا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے بچوں کے لیے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی زبان میں سادگی اور روانی کے علاوہ بچوں سے پیار کی چاشنی بھی تھی۔ سماجی مسائل سے وہ بڑے دلچسپ انداز میں بچوں کو آگاہ کرتے تھے۔ سائنسی موضوعات پر بھی انہوں نے نہایت خوبصورت تحریریں لکھی ہیں۔ بچوں میں علم کا شوق پیدا کرنے، ان میں انسان سے محبت پیدا کرنے اور انہیں باعمل اور محنت شعار بنانے کا جذبہ ان کی تحریروں کی جان ہے۔

احمد ندیم قاسمی رسالہ " پھول " لاہور کے مدیر بھی رہے اور بچوں کے لیے بعض بہت توانا کہانیاں بھی لکھیں، ان میں سے بعض نصابی کتابوں میں بھی شامل ہیں۔ قاسمی صاحب کی نظم " بادل " بڑی مقبول نظم ہے ہے کچھ عرصے سے بچوں کے ادب کی جانب ان کی توجہ کم ہوگئی ہے۔ میرزا ادیب " پھول " کے علاوہ " ادب لطیف " کے مدیر بھی رہے ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے لیکن چونکہ ڈرامہ پڑھنے کی چیز نہیں ہے اس لیے میرے توجہ دلانے پر وہ کہانیوں کی طرف آ گئے۔ ان کی کہانیوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی ہوگی۔ چند ناول بھی انہوں نے بچوں کے لیے لکھے ہیں۔ میرزا ادیب کی اکثر کہانیاں طبع زاد ہیں۔ بچوں کے لیے انہوں نے شاید ترجمہ کیا ہی نہیں ان کی معاشرتی کہانیاں خالص پاکستانی ہوتی ہیں ان کے کردار وطن کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا ایک مہماتی ناول " پہاڑ کی چوٹی پر پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ میرزا ادیب کی کہانیاں سنسنی خیز نہیں ہوتیں وہ عام زندگی اور معاشرے کے چلتے پھرتے کرداروں پر اپنی کہانی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان کی کہانی مکالموں کے ذریعے سے آگے بڑھتی ہے، آہستہ رو لیکن نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ وہ مکالموں میں الفاظ سے نہیں کھیلتے بلکہ واقعات کو سادگی سے بیان کرتے ہیں البتہ کہیں کہیں الفاظ بچوں کی ذہنی سطح سے اونچے ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مقدار کے لحاظ سے بھی میرزا ادیب کا کام بچوں کے ادب کا قابل قدر حصہ ہے۔ میرزا ادیب نے نثر کے علاوہ بچوں کے لیے نظمیں بھی لکھی ہیں جو رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ نظمیں اور غزلیں زیادہ تر مزاحیہ ہیں۔

صوفی غلام مصطفی تبسم نے اپنے مخصوص انداز کی نظموں سے بچوں کے ایک مقبول شاعر کا مقام پایا۔ صوفی صاحب ایک صاحب علم بزرگ تھے۔ خسرو اور غالب کی فارسی شاعری کے حوالے سے ان کا کام خاص طور پر بڑی وقعت کا حامل ہے۔ بچوں کے لیے شاعری میں انہوں نے عام راہ سے بالکل الگ ہٹ کر اپنا انداز بنایا۔ ان کی شاعری بچوں کے دل کو لگنے والی اور زبانوں پڑھنے والی ہے۔ بچوں کو درس اخلاق دینے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ ان کی تفریح اور خوشی کو اہمیت دیتے ہیں، وہ اپنی نظموں کے لیے الفاظ کے انتخاب میں لغات کے محتاج نہیں ہیں، وہ بچوں کی نفسیات کے مطابق الفاظ گھڑتے ہیں اور ان سے مزاح اور لطف پیدا کرتے ہیں' بچوں کی فطرت میں ہنسنا ہنسانا شامل ہے اور صوفی تبسم اس کو پیش نظر رکھتے ہیں، ان کی نظموں کا مجموعہ " جھولنے " ان کے اسلوب کا کامیاب نمائندہ ہے۔

شان الحق حقی آج کے ممتاز غزل گو ہیں لیکن ان کا خلاق ذہن مختلف جہتوں میں اپنے تخلیقی جو ہر نمایاں کرتا ہے۔ حقی صاحب نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ افسانے اور ڈرامے بھی لکھے انسانی موضوعات پر مضامین اور تنقیدیں بھی لکھیں، شیکسپیئر کے ڈراموں کے منظوم ترجمے بھی کیے۔ رسائل کی ادارت بھی کی نظم نثر کی مختلف اصناف اور ترجمہ کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لیے خوبصورت نظمیں لکھی ہیں، زبان پر ان کی غیر معمولی قدرت نے ان سے تہذیبی رچاؤ کے ساتھ بڑی موثر اور دلکش نظمیں کہلوائی ہیں بچوں کے لیے ان کی نظموں کا مجموعہ " سانے ترانے " پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے دونوں ملکوں کے رسالوں میں بھی ان کی نظمیں شامل ہوتی ہیں۔ بچوں کے لیے نثر میں بھی ان کا کام کم نہیں۔ حکیم محمد سعید، تہذیب و ادب کا ایک معتبر نام ہے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے مقبول مصنف ہیں۔ پچھلی دہائی سے انہوں نے بچوں کے ادب کی طرف بھی توجہ کی ہے اور اس مدت میں بچوں کے لیے ان کی کتابوں کی تعداد سو سے متجاوز ہو رہی ہے۔ نظم اور کہانی ان کا میدان نہیں ہے لیکن سچی کہانی" کے عنوان سے حکیم صاحب نے 1992ء میں ہر ماہ کی اپنی ڈائری شائع کی جس میں صبح سے شام تک اپنی مصروفیات لکھی ہیں تا کہ بچے ان سے سبق سیکھیں۔ بچوں کے لیے حکیم محمد سعید کے سفرناموں کی تعداد 35 تک پہنچ گئی یہ بھی اردو ادب اطفال میں ایک منفرد مثال ہے۔ ان کے علاوہ حکیم صاحب کی کتابوں کے موضوعات طب و صحت اور اخلاقیات و دینیات سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی تحریر میں روانی اور زور کے ساتھ جذب کرنے والا انداز ہے۔ شاعر لکھنوی (1917ء۔1989) غزل کے حوالے سے ایک معروف نام ہے۔ اگرچہ ان کا صرف ایک مجموعہ کلام " زخم ہنر " ہی شائع ہو سکا اور بچوں کی نظموں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا لیکن ان کی غزلوں اور بچوں کے لیے نظموں دونوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ شاعر لکھنوی قادر الکلام غزل گو تھے، صحت زبان اور محاورے کی بندش کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بچوں کے لیے ان کی نظمیں صرف رسالہ ''ہمدرد نونہال" میں ہی شائع ہوئی ہیں جن کی تعداد سو سے اوپر ہوگی، نظموں کے عنوانات میں خاصا تنوع ہے۔

محشر بدایونی کا تعلق ریڈیو پاکستان سے تھا اس لیے انہوں نے بچوں کے پروگرام

کے لیے بچوں کی نظمیں لکھنی اور پڑھنی شروع کیں بچوں نے ان نظموں کو پسند کیا تو انہوں نے رسائل میں بھی نظمیں شروع کیں۔اس کے بعد محشر بدایونی نے بچوں کے لیے چند کتابیں مرتب کیں، ان کے نام یہ ہیں بین باجے شاعر نامہ اور سائنس نامہ محشر کی نظموں کا حسن ان کی زندگی ہے۔

ان نظموں میں فکری گہرائی اور بوجھل پن نہیں ہے، محشر بدایونی کو ان کی کتاب شاعر نامہ پر انجمن ترقی اردو نے نقد انعام بھی دیا تھا۔

غلام عباس بچوں کے مشہور رسالہ "پھول" کے آٹھ سال تک ایڈیٹر رہے۔ڈرامے اور کہانیاں بھی لکھیں اور نظمیں بھی۔وہ بچوں کے رسالے سے وابستگی کی بنا پر بچوں کے مزاج شناس ہو گئے تھے اور بچوں کے مطالبات کو سمجھنے لگے تھے۔ان کی نظمیں آسان زبان اور انداز بیان رواں ہے، نظموں کا مجموعہ "چاند تارا" شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔انہوں نے ترقی اردو بورڈ کراچی کی فرمائش پر "پھول" کا انتخاب بھی کیا تھا۔

ابن انشاء خوش فکر شاعر تھے، شگفتہ نثر لکھنے والوں میں اپنے دور کے ممتاز ترین ادیبوں میں سے تھے۔ان کے سفرنامے اور جنگ میں شگفتہ کالم بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ان کے ہاں مزاح کے ساتھ لطیف طنز بھی ہے جو قاری کے دل میں اتر جاتا ہے، شاعری میں بھی ان کا مخصوص انداز تھا ان کی نظموں میں گنگنانے والی کیفیت ہے، بچوں کے لیے ابن انشاء کی شاعری میں بڑی دلکشی اور بہاؤ ہے۔بلو کا بستہ "ان کا مجموعہ بچوں کے ادب میں اہمیت کا حامل ہے۔

اشرف صبوحی 1908ء-1978ء زبان دہلی میں سند کا درجہ رکھتے تھے نہایت فصیح و سلیس زبان لکھتے تھے جو لفظ یا محاورہ ان کی تحریر میں آ گیا سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اشرف صبوحی قدیم تہذیب اور معاشرت کا نمونہ ہیں، ہر طبقے اور حلقے میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ان کے لکھے ہوئے خاکے "دیلی کی چند عجیب ہستیاں" دیلی کی ثقافت اور زبان کا بہترین نمونہ ہیں ان کی کتاب کو بابائے اردو نے انجمن ترقی اردو کے تحت جاری کردہ اردو کے امتحانات میں شامل کیا تھا۔صبوحی صاحب کی ایک اور کتاب "غبار کارواں" میں بھی زبان کا وہ چٹخارہ ہے جو اب نایاب ہے۔ بچوں کے لیے اشرف صبوحی نے کافی کہانیاں اور متعدد کتابیں لکھی ہیں۔

نظر زیدی بہت پرانے لکھنے والے ہیں۔پندرہ روزہ ہدایت "لاہور کے عرصے تک مدیر رہے اور سیکڑوں کہانیاں لکھیں ان کی کہانیوں کے متعدد مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ان کا مقصد بچوں کی اخلاقی تربیت ہے۔اس لیے تاریخ اور بچے واقعات کے پس منظر میں ایسی کہانیاں لکھتے: تے ہیں جن سے بچے سبق سیکھیں اور ان کے کردار کی مثبت تعمیر ہو۔ان کا انداز تحریر سادہ رواں اور دلچسپ ہے۔ابو تمیم فرید آبادی نے بچوں کے لیے بہت لکھا ہے۔

ان کی کافی کہانیاں پاکستان بننے سے پہلے شائع ہو چکی تھیں لیکن آزادی کے بعد بھی انہوں نے نہ بچوں کو بھلایا اور نہ قلم ہاتھ سے رکھا۔

عبدالواحد سندھی نے بچوں کے لیے لکھنے کی ابتدا جامعہ ملیہ دہلی کے زمانہ قیام سے کی اور بچوں کے لیے نہایت دلچسپ مفید اور معلوماتی کتابیں لکھیں، ان کی کتابیں اصلاحی ہونے کے علاوہ تاریخی موضوعات پر ہیں۔انہوں نے سیرت نبوی اور تاریخ اسلام پر نہایت آسان زبان میں کتابیں لکھنے کے علاوہ دلچسپ کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

پروفیسر وحیدہ نیم (1927ء-1996ء) ایک پرگو شاعرہ تھیں، غزلوں اور نظموں کے علاوہ انہوں نے افسانے اور ناول بھی لکھے۔ناول ایک درجن سے کم نہ ہوں گے۔اس کے علاوہ انہوں نے دکن کے اولیائے شاہان بے تاج" کے نام سے ایک تاریخی کتاب لکھی تھی۔بچوں کے لیے بھی وحیدہ نسیم نے بہت ہے۔چھوٹی چھوٹی مزیدار نظموں کے علاوہ انہوں نے ہمدرد نونہال میں عرصے تک سائنسی مضامین بھی لکھے اور بڑی خوبی سے بچوں کو سائنسی معلومات بہم پہنچائیں۔انہوں نے بچوں کے لیے بڑی خوبصورت کہانیاں بھی لکھیں، ان کی زبان میں سادگی اور روانی کے ساتھ بیان میں وضاحت بھی تھی، سائنس کی پروفیسر تھیں اس لیے ان کے لیے سائنس کو آسان زبان میں سمجھنا مشکل نہ تھا۔

قمر ہاشمی کہنہ مشق شاعر تھے۔طویل نظموں پر مشتمل ان کی دو کتابیں مرسل آخر (سیرت نبوی اور نزوان ساگر (گوتم بدھ) خاص طور پر ان کے شاعرانہ مقام کو متعین کرتی ہیں۔"تماشا طلب آزار" کے نام سے انہوں نے گزرے ہوؤں کے حسن فن اور حسن کردار کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا تھا اگرچہ ان کا کوئی دیوان شائع نہیں ہو سکا لیکن ان کے کلام کو جمع کیا جائے تو کئی دیوان مرتب ہو سکتے ہیں۔بچوں کے لیے قمر ہاشمی نے سیکڑوں نظمیں لکھی ہوں گی لیکن ان کا بھی کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ بچوں کے لیے ان فلموں میں توانائی اور حسن ہے، زبان روایتی نہ ہونے کے باوجود مشکل اور نامانوس نہیں ہے، قربانی نے بچوں کے لیے نثر میں بھی لکھا ہے۔

ساقی فاروقی نے پچاس کے عشرے میں بچوں کے لیے بڑی جاندار نظمیں لکھی ہیں وہ صرف ہمدرد نونہال میں بچوں کی نظمیں لکھتے تھے، ان کی نظموں میں بچپن بھی ہے اور نیا انداز بھی، ندرت ہے اور نامانوس فضا نہیں ہے۔

پاکستان سے چلے جانے کے بعد انہوں نے بچوں کے لیے کچھ نہیں لکھا۔

حسن عابدی ممتاز شاعر اور صحافی ہیں' بچوں کے لیے بھی انہوں نے پیاری پیاری نظمیں کی ہیں، ان کی نظموں میں بچوں کے مزاج اور رجحان کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ صوتی آہنگ کو اہمیت دی گئی ہے۔نظموں کا ایک مجموعہ "کاغذ کی کشتی" شائع ہو چکا ہے جس کی بعض نظمیں بچوں کی زبانوں پر چڑھ گئی ہیں۔





رئیس فروغ (1926ء-1982ء) نے بھی بڑوں کے علاوہ بچوں کے لیے بھی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔"رات بہت ہوا چلی" ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ رئیس فروغ نے نثری نظمیں بھی لکھی ہیں، بچوں کے لیے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "ہم سورج چاند ستارے" بھی شائع ہوا تھا۔ان کی نظموں میں زور و شور نہیں بلکہ آہستگی اور بے تکلفی ہے۔وہ ایک شریف سادہ اور ہنس مکھ انسان تھے۔بچوں کی شاعری میں اس کی جھلک اور بچوں سے محبت عیاں ہے۔

اے حمید کثیر التصانیف ادیب ہیں، بچوں کے لیے انہوں نے بہت لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں، بچے انہیں شوق سے پڑھتے ہیں ان کی کتابوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی ہے۔نونہال ادب (ہمدرد) کے لیے انہوں نے سائنسی فکشن اور مسلم سائنس دانوں کے کارناموں پر کہانی کے انداز میں دو سلسلے لکھے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اردو کے ممتاز محقق ہیں اور تاریخ اردو ادب پر بڑی دلجمعی اور جستجو کے ساتھ وقیع کام کر رہے ہیں۔بچوں کے لیے بھی وہ لکھتے رہتے ہیں۔ ہمدرد نونہال اور بچوں کے دوسرے رسائل میں بھی انہیں نے لوک کہانیاں لکھی ہیں۔بچوں کے لیے ان کی دو کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

علی ناصر زیدی سائنس کے استاد اور فوج کے تعلیمی شعبے سے متعلق تھے، انہوں نے عام آدمی کے لیے سائنس پر بہت کچھ لکھا ہے۔بیسویں کتابیں اور سیکڑوں مضامین ان کی یادگار ہیں۔اردو میں سائنسی ادب کی ثروت میں اضافہ کرنے میں علی ناصر زیدی کا بڑا حصہ ہے۔بچوں کے لیے بھی انہوں نے بہت لکھا ہے۔سیکڑوں سائنسی معلوماتی مضامین کے علاوہ کئی مستقل کتابیں بھی بچوں کے لیے لکھی ہیں۔مسلمان سائنس دانوں کے کارناموں اور بڑے بڑے موجدوں کے حالات بھی انہوں نے عام فہم اور رواں اردو میں لکھے ان کی تحریر الجھاؤ سے پاک اور مختصر جملوں پر مشتمل ہوتی تھی۔مشکل الفاظ سے گریز کرتے تھے، اصطلاحات کو وضاحت سے سمجھاتے تھے۔غیر ضروری طول سے گریز کرتے تھے۔

شفیع عقیل اردو صحافت و ادب کا معروف نام ہے وہ کثیر الاشاعت اردو روزنامہ "جنگ" سے شروع سے وابستہ رہے ہیں لوک کہانیوں پر انہوں نے جم کر کام کیا ہے۔پنجابی لوک داستانیں اور کہانیوں کے علاوہ چینی لوک کہانیاں، جاپانی لوک کہانیاں اور لوک داستانوں اور قدیم پنجابی شعراء پر تحقیقی کتابیں شفیع عقیل کا قابل قدر کام ہے۔ان کے علاوہ خود ان کا پنجابی کلام بھی اردو ترجمے کے ساتھ دو کتابوں میں شائع ہو چکا ہے۔شفیع عقیل ملکوں ملکوں گھومے بھی ہیں لیکن سفرنامہ انہوں نے صرف ایک لکھا ہے۔بچوں کے رسالے "بھائی جان" کے بھی کم و بیش دس سال تک مدیر رہے اور بچوں کے لیے خود بھی لکھا اور لکھوایا۔ بھائی جان بچوں کا پسندیدہ رسالہ تھا اس کے کئی خصوصی شمارے جھوٹ نمبر چوری نمبر شرارت نمبر، بچپن نمبر اور پٹائی نمبر شائع ہو کر مقبول ہوئے۔شفیع عقیل نے بچوں کے لیے اپنی تحریروں میں شگفتگی اور ہلکے پھلکے مزاح کا پہلو پیش نظر رکھا بچوں کے لیے ان کی دو کتابیں بچپن کی شرارتیں اور حبشیوں کا دیس شائع ہو چکی ہیں۔

سعید لخت بڑے استقلال کے ساتھ کم و بیش چالیس سال سے بچوں کے ادب سے وابستہ ہیں، بچوں کے رسالے "تعلیم و تربیت" کے مدیر رہے اور زیادہ تر اسی کے واسطے سے بچوں کے لیے کہانیاں اور معلوماتی تحریریں لکھیں، ان کی چند کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ان کی تحریریں سہل و سادہ زبان میں ہوتی ہیں۔

اشتیاق احمد جاسوسی قسم کی ناولوں کے حوالے سے آج کے بچوں کا بہت مقبول نام ہے۔ بچے ان کی کتابیں شوق سے پڑھتے ہیں، ان کی کتابوں کی تعداد چھ سو سے کم نہ ہوگی۔وہ مکالموں کے ذریعے سے اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں، قاری میں تجسس پیدا کرتے ہیں اور دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے کہانی کو انجام تک پہنچاتے ہیں وہ اپنی کہانیوں میں کہیں نہ کہیں اخلاقی سبق بھی شامل کر دیتے ہیں۔

رحمان مذنب اردو کے منجھے ہوئے لکھنے والے ہیں اور انہوں نے متعدد کتابوں کے علاوہ رسائل کے لیے بھی خاصا لکھا ہے بچوں کے لیے بھی ان کی تحریریں اچھی تعداد میں ہیں، ان کی لکھی ہوئی کہانیاں دلچسپ اور آسان زبان میں ہوتی ہیں۔

عبدالمجید بھٹی نے بچوں کے لیے خاصی نظمیں لکھی اور ان کے متعدد مجموعے بھی مرتب ہوئے ہیں وہ اپنی نظموں کو وعظ و نصیحت سے گراں بار نہیں کرتے سادہ اور روان انداز اختیار کرتے ہیں اور بچ سکی دلچسپیوں اور معصوم سوچ کو ملحوظ رکھ کر الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں ان کی نظموں کے چند مجموعوں کے نام یہ ہیں می ترانے اخلاقی نظمیں بولتی تصویریں۔

سرور بجنوری نے بچوں کے لیے عرصے تک نظمیں لکھیں۔بچوں کے رسائل کے علاوہ ان کے دو تین مجموعے بھی چھپے مختلف موضوعات پر رواں دواں نظمیں لکھنے کی اچھی صلاحیت تھی۔زندگی نے زیادہ وفا نہ کی۔

عشرت رحمانی آزادی سے بہت پہلے لکھ رہے تھے اور بچوں کے لیے انہوں نے خاصی نظمیں لکھیں جو رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ان نظموں میں موضوعات کا خاصا تنوع بھی تھا لیکن بحیثیت شاعر ان کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔نثر میں بھی عشرت رحمانی کا کام بچوں کے لیے کم نہیں ہے۔انہوں نے دوسرے ملکوں کی کہانیاں بھی اردو میں منتقل کیں اور ناول بھی لکھے، ناول ایک درجن سے زائد ہی ہوں گے جن میں مزاح بھی ہے اور تاریخی پس منظر بھی۔عشرت رحمانی ریڈیو سے عرصے تک منسلک رہے اس لیے ان کو ریڈیو کے لیے بھی بچوں کی تحریریں لکھنے میں مہارت تھی۔ان کو زبان پر قدرت حاصل تھی۔وہ سادہ اور آسان لکھتے تھے، انہوں نے اپنے نام کے علاوہ مختلف قلمی ناموں سے بھی لکھا ہے۔

شبنم رومانی معروف شاعر ہیں ایک زمانے میں اپنی "مثنوی سیر کراچی" کے حوالے سے شہرت حاصل کی۔ مجموعہ کلام "جزیرہ" اور نثر میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اخبار میں ادبی کالم بھی لکھتے تھے جن کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ شبنم نے ٹی وی پر بچوں کے پروگرام کے لیے نظمیں بھی لکھیں جو مقبول ہوئیں۔ ایک کتاب ''موزے چلغوزے'' کے نام سے شائع بھی ہو چکی ہے۔ رسائل میں بھی گاہے گاہے ان کی نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے مشاہیر علم وادب کے حالات اور خدمات پر نہایت دلچسپ انداز میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان مشاہیر میں مرزا غالب حسرت موہانی، امیر خسرو میرامن' ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد شامل ہیں۔ ان کی کتابوں کی زبان سلیس اور بامحاورہ ہے، وہ مختلف رسائل میں لکھتے رہے ہیں۔ عرصہ پہلے وہ بچوں کے ایک رسالے کے مدیر بھی رہے ہیں۔ وہ اردو کے استاد اور چند تحقیقی کتابوں کے مصنف بھی ہیں ان کو خاکے لکھنے میں بھی مہارت حاصل ہے۔

محترمہ ثاقبہ رحیم الدین کو بچوں کی فلاح و بہبود سے خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ انہوں نے بڑے بچوں کے لیے چند کتابوں کے علاوہ دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

عزیز اثری کی عام شہرت کا ذریعہ ان کا ناول "عالی پر کیا گزری" بنا۔ اس ناول میں انہوں نے بچوں کے اغوا کو موضوع بنایا اور بڑی کامیابی اور توانائی سے کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ ناول خوب مقبول ہوا۔ عزیز اثری بچوں کے ایک رسالہ کے مدیر بھی رہے اور انہوں نے اس میں دلچسپ تحریریں لکھیں اور لکھوائیں۔ علی اسد کو ترجمہ میں خوب مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے جارج ایلیٹ۔ پی جی وڈ ہاؤس اور سمرسٹ ماہم کے علاوہ مختلف انگریزی افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے تراجم بڑی خوبی کے ساتھ معیاری زبان میں کیے ہیں۔ بچوں کے لیے بھی انہوں نے بے شمار کہانیوں کے تراجم کیسے جو ہمدرد نونہال میں بڑے شوق سے پڑھے گئے۔ ان کی یہ کتابیں بھی بچوں کے لیے شائع ہو چکی ہیں۔ ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی، قصہ اژدھا پکڑنے کا قصہ حاتم طائی (تلخیص)۔ .

محمود شام ممتاز شاعر، صحافی اور آج کل روزنامہ "جنگ" کے ایڈیٹر ہیں۔ وہ بچوں کے لیے ایک ماہنامہ ٹوٹ بٹوٹ بھی نکالتے رہے ہیں جس میں انہوں نے نئے لکھنے والوں کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کی۔ بچوں کے لیے ان کی نظمیں پسند کی جاتی تھیں لیکن انہوں نے ابھی یکہ، ان کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا۔ قمر علی عباسی اردو کے معروف سفرنامہ نگاروں میں شامل ہیں۔ ان کے کم وبیش ایک درجن سفرنامے شائع ہو چکے ہیں لیکن انہوں نے لکھنے کی ابتداء بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے سے کی تھی۔ ان کا ناول " بہادر علی " خوب مقبول ہوا اور اس کے کئی ایڈیشن پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی شائع ہو چکے ہیں ابتدا میں ان کا رجحان جانوروں کی کہانیاں لکھنے کی طرف تھا۔ قمر علی عباسی نے تحریک پاکستان کے بارے میں بھی تین مختصر کتابیں لکھی ہیں جن میں آسان اور دلنشین انداز میں تحریک پاکستان کے بارے میں بچوں کو بتایا گیا ہے۔ معراج انگریزی کہانیوں کے خوب صورت اردو ترجمے کرتے ہیں۔ وہ مختصر جملے لکھتے ہیں اور زبان کی سیاست پر بڑی محنت کرتے ہیں۔ ترجمہ کے لیے کہانی کا انتخاب بھی بڑی تلاش وجستجو کے بعد کرتے ہیں۔ خواجہ محمد عارف ایک کالج میں ریاضی کے استاد ہیں اور قلمی نام "معراج" ہے۔ 20 - 25 سال سے خوبصورت ترجمے کر رہے ہیں جو رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ نونہال قارئین ان کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں ان کی تین کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی نے بڑوں کے علاوہ بچوں کے لیے بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ سرسید پر ان کی کتاب کو بچوں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے۔ ایک اور کتاب اندمیرے سے روشنی تک" بھی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ان کا اسلوب دلکش اور اثر انگیز ہے ان کو بچوں سے باتیں کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔

مولانا محمد زکریا مائل فاضل آدمی تھے۔ عربی اور انگریزی سے نہایت بامحاورہ ترجمہ کرتے تھے، عربی ترجمہ پر تو ان کو اتنا عبور تھا کہ پڑھنے والے کو ترجمہ کا گمان تک نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے بچوں کے لیے عربی کہانیوں کے بڑے خوبصورت ترجمے کیے ہیں۔ مولانا اعجاز الحق قدری نے سندھ کی تاریخی کہانیاں" کے علاوہ بچوں کے لیے اسلامی تاریخ کی مختلف شخصیات پر سیدھی سادی زبان میں بہت سے مضامین لکھے ہیں۔

طالب ہاشمی نے بڑوں کے لیے سیرت نبوی صحابہ کرام اولیا اور بزرگان پر بیسویں ضخیم کتابیں لکھی ہیں، بچوں کے لیے ان کی 42 کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں چند کے نام یہ ہیں صبر کی تصویر، غمگسار بیوی، شریف دشمن خدائی امتحان، شیر دل سلطان، توبہ کی برکت سرام کا سپاہی، کرخ کا درویش، ان کی تمام کتابیں تاریخی اور نیم تاریخی واقعات پر مبنی ہیں۔ ان کا مقصد بچوں کو اخلاق وکردار کے اعلیٰ نمونوں سے روشناس کرانا اور ان میں اسلامی جذبہ پیدا کرنا ہے۔ طالب ہاشمی آسان، رواں، اور بامحاورہ زبان لکھتے ہیں۔ مشکل الفاظ سے گریز کرتے ہیں۔ تاریخی ناموں پر اعراب بڑے اہتمام سے لگاتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کو صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ رفیع الزماں زبیری نے ادھر چند سال سے بچوں کے لیے بھی لکھنا شروع کیا ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں ان کی یہ کتابیں دینی اور تاریخی موضوعات پر اور 31 کہانی کی کتابیں نونہال ادب ہمدرد کے تحت شائع ہو چکی ہیں۔

سیما قاسمی نے پچاس اور ساٹھ کے عشروں میں جنوبی ایشیا کی لوک کہانیاں سلیس اور بامحاورہ اردو میں لکھیں۔ مناظر صدیقی سینئر صحافی تھے اور متعدد روزناموں میں کام کر

چکے تھے۔ انہوں نے بچوں کے لیے انگریزی سے روایتی اور سماجی کہانیاں بڑی کامیابی سے منتقل کیں۔ اپنے انتقال (1900ء) تک 20-25 سال میں انہوں نے پچاسوں کہانیاں ترجمہ کی ہوں گی۔ ترجمہ معیاری ہوتا تھا۔

روی مستشرق خاتون ڈاکٹر لدمیلا داسے لیوانے بھی چند روی کہانیوں کا صاف اور رواں اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ پروفیسر عمر انصاری نے بھی بچوں کے لیے چند اچھی نظمیں لکھی ہیں اور معلوماتی مضامین کے اپنی دلکش نظر میں ترجمے کیے ہیں۔ ان کے علاوہ جو شعرائے وقت بچوں کے لیے نظمیں لکھ رہے ہیں ان میں سے چند اہم نام ہے ہیں۔ قتیل شفائی، محسن احسان انور شعور، سلیم فاروئی پروفیسر عنایت علی خاں، خواجہ عابد نظامی منی دیاری عباس العزم ضیاء الحسن ضیاء تنویر پھول۔ بچوں کے رسائل نے بھی بچوں میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس وقت بچوں کے جو رسائل پاکستان کے مختلف شہروں سے نکل رہے ہیں ان میں سے خاص خاص کے نام یہ ہیں۔

آنکھ مچولی، کراچی، ظفر محمد شیخ
انوکھی کہانیاں، کراچی، محبوب الہیٰ مخمور
بچوں کا باغ، لاہور، ایم یوسف کلثوم بانو
بزم القران، لاہور، عبدالرشید ساجد
بچوں کا دوست، گجرات،
روبی نیازی محمد رفیق رضوی
پنکڑی، لاہور، غلام محمد گلشن،
شیخ صادق علی
پھول، لاہور، مجید نظامی اختر عباس
پیغام، لاہور، اشفاق احمد خان
تعلیم وتربیت، م لاہور،
عبدالسلام تعلیمی ڈائجسٹ
، لاہور، عاطف طفیل
ٹوٹ بٹوٹ، کراچی، مصور راؤ
جگنو، لاہور، عبیداللہ محمود
چندا، کراچی، مسز شاکرہ،
چھوٹی دنیا، لاہور، قیصر فرزانہ خزانہ، کراچی۔
مرزا ظفر بیگ
ذہین، لاہور، ابووقاص
ساتھی، کراچی، عبدالحامد
شاہین ڈائجسٹ پشاور، عباس راحت اعوان
شہباز کوئٹہ
ڈاکٹر فیض محمد بلوچ
دوست، کراچی، شکیل احمد ضیاء
مجاہد، کوٹلی ابرار گردیزی
معصوم، آسلام آباد، غلام حسن نقوی
معمار جہاں، کراچی، کرم داد خان
نور، لاہور، بنت مجتبیٰ مینا
کلیاں، کراچی، صفیہ ملک
ہمدرد نونہال، مسعود احمد برکاتی

بچوں کے ادب کے اس جائزے سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بچوں کے لیے لکھنے والے ادیبوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صرف بچوں کے لیے لکھنے والوں کی تعداد کم بہت ہی کم ہے۔

بشکریہ: نیشنل لائبریری اسلام آباد